خواجہ محمد امین بچھ

ترتیب

پروفیسر غلام رسول ملک
ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اقبال اکیڈمی سری نگر

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

بیاد

خواجہ محمد امین بچھ

ترتیب

پروفیسر غلام رسول ملک | ڈاکٹر بشیر احمد نحوی



اقبال اکیڈمی سرینگر کشمیر

نام کتاب ـــــــ بیادِ خواجہ محمد امین بچھ
زیرِ اہتمام ـــــــ اقبال اکیڈمی کشمیر
سالِ اشاعت ـــــــ جون ۱۹۹۴ء
قیمت ـــــــ ۷۰/- روپے Rs. 70/=

PUBLISHED BY
IQBAL ACADEMY

through
BOOK MEDIA SRINAGAR
Printers & Publishers
KALLU BUILDING, GAW KADAL
SRINAGAR-190001 (KASHMIR)

(ANU)

ملنے کا پتہ

- صدر دفتر اقبال اکیڈمی کشمیر
- این۔ بی موٹرس گاؤکدل سرینگر
- کتاب گھر امیرا کدل سرینگر
- دلکشا، برین نشاط کشمیر

انڈین پرنٹنگ پریس لال منڈی مگر بیت سرینگر

اِنتساب

خوش نوا شاعر

مرحوم عبدالحق برقؔ

کے

نام

جو ساری عمر امین صاحب کے باوفا دوست رہے

Title ______________________

Author ______________________

Accession No. ______________________

Call No. ______________________

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

(اقبالؒ)

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

فہرست

۷۸۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

خواجہ محمد امین بچھ مرحوم کشمیر مینونظیر کے ان لالہ و گل میں سے ہیں جنکی رونق، رعنائی اور مہک ہماری مجالس فکر و ادب کو ہر وقت معطر بناتی رہے گی۔ امین صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ سخن سنج، سخن شناس، علم دوست، ادب نواز اور سب سے بڑھ کر ایک پرخلوص شخصیت کے مالک تھے۔ آج کے اس دورِ تلبیس میں اخلاص، ایثار اور مودّت کا عملی مظاہرہ بہت بڑی بات ہے، کیونکہ ہر انسان نفسا نفسی، خود غرضی اور مادی مرغوبات کے الٹ پھیر میں ایسے گھرا ہوا ہے کہ دوسرے کے لیے خیر خواہی، احسان و ایثار کا اظہار خیال است و محال است و جنوں ہو کر رہ گیا ہے۔ غیر کے دکھ درد کو اپنا ذاتی درد اور کرب سمجھنا۔ کسی کی خاطر اپنا وقت نکال کر اسکی مدد کے لیے آگے آنا، حق کو پورے اعتماد کے ساتھ حق سمجھنا اور باطل کی ہر ادا پر نفرت اور آتش و آہن کا انداز اختیار کرنا ہمارے مصلحت آمیز عہد میں ممکن ہی نہیں ______ لیکن مرحوم امین صاحب متذکرہ صفات اور خصائل کے عملی پیکر تھے۔ اقبال کے الفاظ میں

ع میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

امین صاحب کی علم دوستی، ادب نوازی، خاندانی شرافت و نجابت سے کون آگاہ نہیں۔ وہ بلاشبہ پرانی قدروں کے امین اور اسلاف کے روشن کارناموں کے نقیب تھے۔

شاعر مشرق ترجمان الحقیقت حضرت اقبالؒ کے ساتھ مرحوم کی والہانہ عقیدت تھی۔ وہ اقبال کے کلام اور پیغام کو ہر گھر، ہر شہر، ہر بستی اور محفل میں عام ہونے کے متمنی تھے۔ اقبال اکیڈمی کشمیر کے یوم آغاز سے ہی وہ اسکی تقاریب اور مجالس میں گرمجوشی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ سرما اور گرما کی شدتوں اور صعوبتوں سے بالاتر ہو کر اکیڈمی کو اپنی شمولیت اور باضابطہ حاضری سے رونق بخشتے تھے۔

اقبال اکیڈمی کے ایک ہنگامی اجلاس میں مرحوم کی یاد میں ایک ادبی اور تعزیتی مجلس منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ ۲۰ جون ۹۳ء کو برین نشاط میں انکے گھر پر ریاست کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے مرحوم و مغفور کی ہمہ پہلو شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ مرحوم کی زندگی، علم و ادب اور صحافت سے انکی وابستگی، انکی سیاسی و سماجی خدمات اور نظریات پر پڑھے گئے مقالات اور تقاریر کو یکجا کرا کے کتابی شکل میں شایع کیا جائے۔ اقبال اکیڈمی کو آج یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ "بیاد خواجہ محمد امین پچھ" کے عنوان سے مرحوم کے ساتھ ادیبوں، شاعروں اور انکے مداحوں کے تعلقات اور حسین یادوں پر مبنی کتاب آپکے ہاتھوں کی زینت بنے۔ کتاب میں چند تقاریر بھی شامل ہیں جو من و عن شایع کی گئیں۔

جہاں تک امین صاحب پر علمی اور تحقیقی کام کا تعلق ہے۔ وہ مرحوم کی خود نوشت ادبی و معلوماتی ڈائریوں کے مطالعہ اور اس سے اخذ شدہ نتائج و اثرات کے بعد ہی انجام پذیر ہوگا۔ اقبال اکیڈمی پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ۹ ڈایریوں کو ترتیب و تدوین کے عمل سے نکال کر ایک شاندار ادبی اور علمی کارنامہ اہل علم و دانش

کے سامنے پیش کرے۔ گرامی قدر مرغوب صاحب نے پہلے ہی اس کا نام "خزینۂ امین" تجویز کیا ہے۔ اس خزینے کو باہر نکال لینے اور عوام تک پہنچانے کے لیے محنت اور وقت درکار ہے۔ اس وقت امین صاحب کے مداحوں اور دوستوں کی نگارشات پر مشتمل گلدستہ آپ کے ہاتھوں میں ہے' امید ہے کہ اقبال اکیڈمی کی یہ کوشش علمی اور ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گی۔ ؛؛

بشیر احمد نحوی

Title ______________________________

Author ______________________________

Accession No. ______________________________

Call No. ______________________________

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



یوم اقبال کی ایک تقریب

غلام محمد واعظ، محمد امین بچھ، محمد عبداللہ شیدا، مرزا عارف اور بشیر احمد نحوی

Title ______

Author ______

Accession No. ______

Call No. ______

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



اقبال اکیڈمی کی تین روزہ کانفرنس (۱۹۸۷ء) کے بعد لی گئی تصویر۔

(تصویر میں دائیں سے بائیں) حامدی کاشمیری، منظر امام، عبدالحمید متو، محمد امین بچھ، مشتاق احمد مرغوب بانہالی، مرزا عارف بیگ، غلام نبی ہاگرو، ڈاکٹر عبدالسلام، انجینئر غلام رسول میر، بشیر احمد نحوی، بشارت احمد اور عبدالغنی مدہوش۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

مرزا عارف

وہ آہنی اِرادوں کا مالک

رِشتہٕ دوٚرایہِ دوستی ہُند ناوتھو اٚمِس پننس
نظرِہ ہُند لوٚگ دھوکہ اسہِ گلزار وینٚد یتھ دُدونس
سینہٕ چوٚن گنجینہٕ علمُک زندہ دل روشن دماغ
ژھوٚبہٕ چاۓ محمد امین بجھ شرا کھ زٕن وایاں منس

یہ زندگی ایک بیّن حقیقت ہوتے ہوئے بھی کتنی بے حقیقت ہے! دوستی کا رشتہ جو چند روز بڑا استوار معلوم ہوتا ہے۔ آخر کار ایک کچا دھاگا ثابت ہوتا ہے۔

یہ چمن جو دل لبھاتا ہے۔ آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا ہے۔ پھلتا پھولتا ہے۔ دراصل ایک ویرانہ ہے۔ ہم ہی اس کو پائیدار سمجھکر خود فریبی کے شکار ہوتے ہیں۔

آہ! وہ آہنی ارادہ کا مالک محمد امین بچھ جو مزاج پرسی پر ہاتھ ران پر مار کر بڑے طمطراق سے کہہ اٹھتا تھا کہ میں تو ابھی چوہتر سال کا جوان ہوں۔ ایک ہی گردے پر سال ہا سال سے قانع۔ ہائی شوگر ہوتے ہوئے ہر سیمنار، ہر بزمِ شعر ہر محفلِ بحث و مباحثہ کی رونق

ہوا کرتا تھا۔ جس کی گرمی گفتار سے در و دیوار ہمہ تن گوش بن جاتے تھے۔ جس کا سینہ علم و ادب کا خزینہ تھا۔ جس سے برجستہ اور بلند تخیل سے لبریز شعر موتی کی لڑیوں کی طرح برمحل نمودار ہوتے تھے۔ جسکی زندہ دلی مردہ دلوں کو جلا بخشتی تھی اور جسکی موزون و مناسب حاضر جوابی اور روشن دماغی دیکھ کر ہر کس و ناکس دھنگ رہ جاتا تھا۔ آج اپنی دل خراش چپکی سادھے ہوئے ہے۔ جیسے آپ نے کبھی زبان کھولی ہی نہیں تھی۔ آنکھیں ایسی پھیر لی ہیں۔ جیسے اپنے احباء و اقارب کو پہچانتے ہی نہیں۔ شعر و شاعری کے رسیا کو جیسے کبھی اس فن سے وابستگی تھی ہی نہیں۔

یا اللہ! یہ کیا ڈرامہ ہے! کس کے ہاتھ میں اس گنجینۂ علم و ادب کی چابی تھی۔ کون اس زبان گوہر فشاں کو گویائی بخشتا تھا۔ کون سی وہ قوت غیبی تھی۔ جو اپنے علم دوست مہمانوں کیلئے اس مرد یگانہ کو ہمہ تن محو میز بانی بناتا تھا؟

کیا در حقیقت وہ محض ایک پیکر خاکی جو اتنی خوبیوں کا مالک تھا۔ کیا یہ کوئی رموٹ کنٹرول والا نظارہ تھا کہ مضراب کہیں کوسوں دور سے میں آتا تھا اور یہ ساز صد خوش آواز جسکو ہم اپنی متاع عزیز پر خلوص دوست محمد امین بچھ کہتے تھے۔ اسی نادیدنی مضراب سے بج رہا تھا!

سبحان اللہ! اس عقدہ لا ینحل کو ناخن فکر نے کس کس انداز سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ محتاج بیان نہیں۔

اے کون و مکاں کے مالک! یہ کونسی پوشیدہ مقناطیسی قوت تھی۔ کیسی غیر مرئی برقی تاریں تھیں جو ہمیں آپسمیں کھینچ رہی تھیں۔ اور جو ہمیں اکثر و بیشتر اوقات کبھی آہِ سحر گاہی میں ایک دوسرے کی یاد دلاتی تھیں اور کبھی اشکِ نیم شبی کے دوران دعاؤں کے ساتھ آب دیدہ کرتی تھیں!

رشتہ داری میں منسلک ہونے کی وجہ سے ہم ایکدوسرے سے عرصہ سے روشناس تھے لیکن رسالہ "گلریز" نے ہمیں نزدیک تر کر دیا۔ استاد عبد القادر کبروی مدظلہ، کی دوکان واقعہ کو کر بازار سرینگر علمی و ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ محمد امین بچھ بھی بلا ناغہ آیا کرتے تھے۔

اور رفتہ رفتہ اپنے زورِ قلم سے پہلے ایک نقاد بنکر عوام کے سامنے آگئے اور پھر کئی سال اس کی ادارت کا کام نہایت خوبی سے سرانجام دیا۔

فارسی اور عربی امین صاحب کو ورثہ میں ملا تھا۔ دیگر رؤسائے کشمیر جن کو عرف عام میں "خوجہ" کہا جاتا تھا کی طرح آپ کا خاندان بھی اپنا ثقافتی (CULTURAL BACK GROUND) تشخص رکھتا تھا۔ مشہور کشمیری مقولہ ہے:

"بڑھ بانڈے ہتہ گانز۔ یمے گیہ شہر کی واآنز"

ان تین خاندانوں میں بڑھ خاندان سرِفہرست تھا۔ غرض فارسی اور عربی پر دست رست امین صاحب کو اپنے والدِ محترم مرحوم صدرالدین بچھ سے ملا تھا۔

آپکی والدہ نہایت پارسا خاتون تھی۔ دوربین نگاہ کی مالکہ تھی۔ اپنے تین فرزندوں کے شاندار مستقبل کی متمنی تھی۔ میں ان دنوں عہد شباب میں تھا۔ مجھ سے بھی اس آرزو کے پورا ہونے کے لیئے دعا میں شریک ہونے کی فرمائش کرتی تھی۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت اقبالؒ کا فرمودہ: مراداد ایں خرد پرور جنونے۔ نگاہے مادرِ پاک اندرونے میرے دوست امین صاحب پر بھی صادق آتا ہے اور آپکے محترم برادران عزیز محمد یوسف صاحب اور غلام نقشبند صاحب جو بین الاقوامی اداروں میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ اسی ہمادرِ پاک اندرون کی دعاؤں سے یہ بلندیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

آپکے چاچا خواجہ بہارالدین بچھ نے رسالۂ گلریز میں خطاطی کے وہ جوہر دکھائے۔ جو اگر کسی زندہ قوم کی وراثت ہوتے۔ تو خواجہ موصوف خلعتوں سے نوازے گئے ہوتے مگر زمین مردہ کی پیداوار ہونے کے باعث آج وہ فراموش ہو چکے ہیں۔

امین صاحب کشمیر ریسرچ کونسل کے بھی سرگرم رکن رہے۔ اسمیں بھی ہمیں ایکدوسرے کے بہت قریب آنے کا موقع ملا۔

امین صاحب کی زندگی کثیر الجہتی تھی۔ اِسلئے میں ایسے چند گوشوں ہی کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں، میں کچھ معلومات بہم کرسکتا ہوں۔

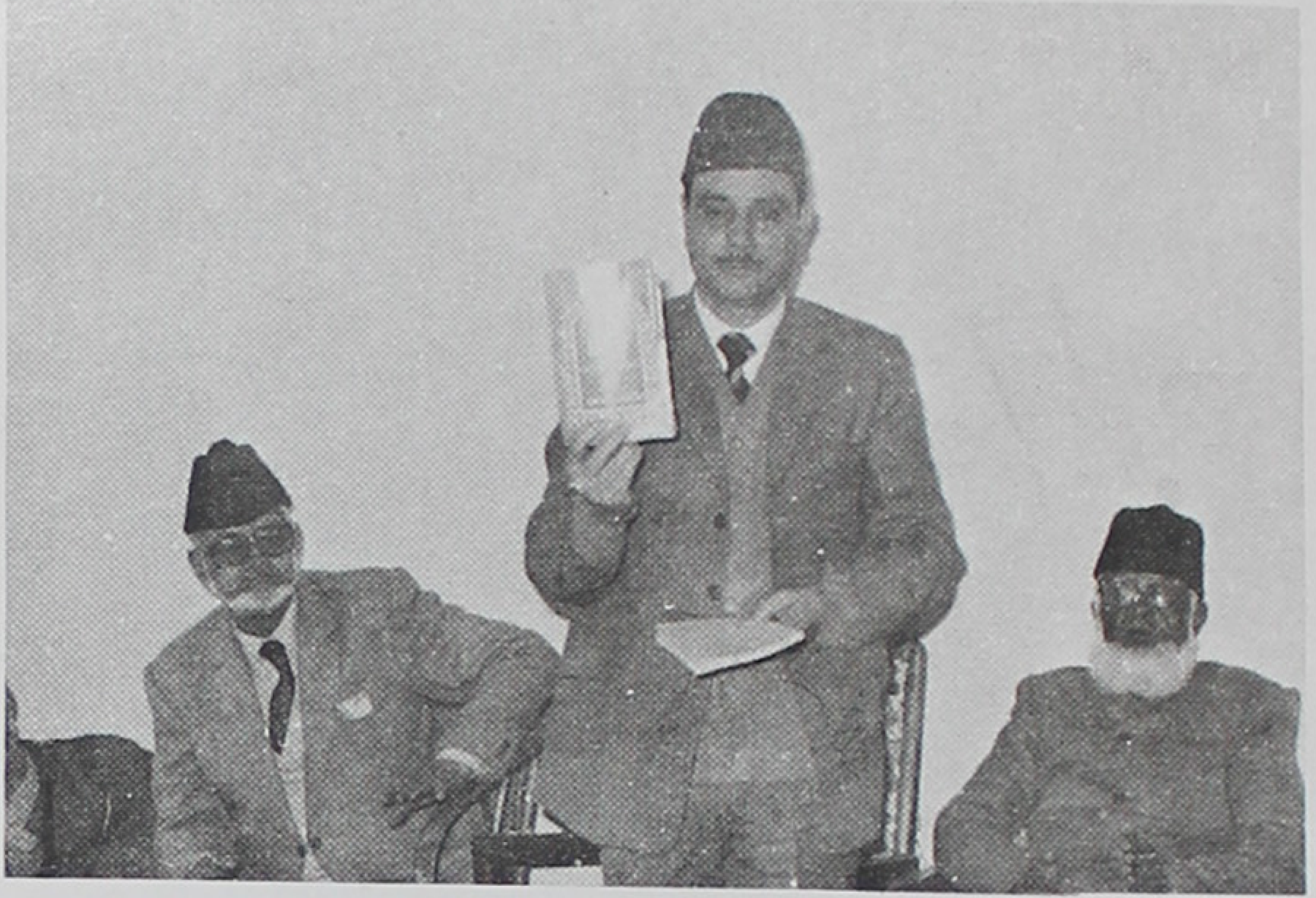
آپ بے باک تھے۔ اللہ کے شیروں کو روباہی نہیں آتی ہے۔ جدّہ کی ایک مسجد میں آمین بالجہر نے جوابی کارروائی پر آمادہ کیا۔ اتفاق سے امام صاحب نے رَبَّنا لاتؤاخِذ نا اِن نسینا ..... کی قرأت فرمائی۔ جب فا النص نا علی القوم الکافرین پر پہنچے تو امین صاحب نے زور سے آمین کہدی۔ اختتام نماز پر عرب اور عجم کے نمازی آپکے گرد جمع ہو گئے اور اس طرح سے آمین پر شدت سے اعتراض کیا۔ آپ ہار ماننے والے تھے نہیں۔ کہا آپ لوگوں نے سورۂ فاتحہ کے اخیر پر جو زور سی آمین کہی۔ میں سمجھا کہ دعا سورت کا یہ حصہ تھا۔ یہاں آمین زیادہ مناسب تھی۔ اس لیئے میں نے آمین کہی! کسی سے کچھ جواب نہیں بن پڑا۔

غلام محمد شاہ کا دور تھا۔ ایکبر وزان سے ملنا ضروری بن گیا۔ باضابطہ ملاقات کا وقت لیا۔ کوٹھی پر گئے۔ انتظار میں بیٹھے رہے۔ پی اے نے چائے بھجوائی۔ کئی بار آکر معذرت کی کہ صاحب مصروف تھے آرہے ہیں۔

آخر ایک منسٹر صاحب آگئے اور شاہ صاحب فوراً نیچے آگئے۔ امین صاحب کی طرف دایاں ہاتھ اٹھاکر سلام کیا اور چلدئے۔

امین صاحب سے رہا نہیں گیا۔ منہ سے نکل پڑا۔ "یہ انسان نہیں" تھوڑی دیر کے بعد حسب عادت لال چوک پہنچے تو وہاں شاہ صاحب کے حاشیہ برادروں (خفتن فقیروں) کی ایک بھیڑ نے آن گھیرا۔

یک زبان ہوکر بڑی گستاخی سے کہا۔ کیا کہا "یہ انسان نہیں" کوئی اور شخص ہوتا تو ٹوٹ جاتا۔ مگر امین صاحب شکست قبول نہیں کرسکتے تھے اور اللہ کے بغیر کسی بشر سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ کہا ہاں میں نے یہ کہا مگر سنو کیوں۔ وہ ذرا جھجک گئے اور امین صاحب نے بلاتامل کہا۔ میں نے کہا وہ انسان نہیں۔ وہ فرشتہ ہے فرشتہ!



بجبہاڑہ میں تاریخ الانبیاء کی رسمِ اجرا کے موقعے پر

امین صاحب — پیرزادہ علی محمد اور مرزا عارف کے ساتھ

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



۲۵ر دسمبر ۸۶ء کو کھنہ بل ڈاک بنگلے میں بچھ صاحب،
عارف صاحب، منظور عالم اور بشیر احمد نحوی کے ساتھ۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

کوئی اور فرشتہ خو ہو یا نہ ہو اپنے امین صاحب بلاشبہ فرشتہ خو تھے۔ جب ایک میٹنگ میں اقبال اکیڈمی نے راقم کی عزت افزائی کا فیصلہ کیا۔ اور تاریخ مقرر کئے بغیر فیصلہ کیا کہ مرزا عارف کا یوم اعزاز منایا جائیگا تو خلوص و محبت کے پیکر امین صاحب نے اعلان کر دیا کہ احد وز ہوٹل پر انکی طرف سے ایک شاندار پارٹی کا اہتمام ہو گا۔

اللہ اکبر! آج راقم کو ایسے ہی دوست کو مرحوم کہنا پڑ رہا ہے۔ ایک دل شکستہ مخلص مشفق سے محروم ہو کر دست بدعا ہونا پڑ رہا ہے۔ کہ یا اللہ۔

رحمت کونین لحد پر گوھر افشانی کرے
رحمت اس پر جو امین کی فاتحہ خوانی کرے

میر غلام رسول نازکی

اور میں اکیلا رہ گیا

دُنیا میں ہر انسان کو یا دشمنوں سے پالا پڑتا ہے، یا دوستوں سے، دوسرے لفظوں میں ہر انسان کا دوست بھی ہوتا ہے اور دشمن بھی۔ مجھے بھی چونکہ انسان ہونے کا دعوےٰ ہے اسلئے میرے بھی دوست ہیں اور شاید دشمن بھی، شاید اس لئے کہتا ہوں کہ میں الحمد للہ کسی کا دشمن نہیں۔ میرے دوست بہت سارے ہیں، مگر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ دوستوں میں سے بعض چیدہ ہوتے ہیں اور اُن کا حلقہ اگرچہ چھوٹا ہوتا ہے مگر اخلاص سے بھرپور ہوتا ہے۔ میرے قریب ترین دوستوں کا حلقہ بھی محدود ہے۔ ان کے نام ہیں سید مبارک شاہ صاحب فطرت مرحوم، جناب غلام محمد میر طاؤس مرحوم، جناب پروفیسر محی الدین حاجنی مرحوم، جناب غلام محمد بیگ مرحوم جناب عبدالحق برق مرحوم اور جناب محمد امین کچھ مرحوم، ان تمام دوستوں کے نام کے ساتھ جب میں مرحوم لکھتا ہوں، تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے دل پر کیا گزرتی ہوتی، اسی جذبے کے تحت میں نے کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے۔

حیدر زبوں ہوں سلسلۂ حادثات ہوں
تنہائیوں کا زہر، جدائی کی رات ہوں
یارانِ غم گسار، محبان راز دار
سب مر گئے میں اب بھی بقید حیات ہوں

فریاد بن کے قید ضمیر حرس میں ہوں
تہمت لگی ہے مجھ پہ کہ میں اپنے بس میں ہوں
اک بیکراں فضا میں اڑنا چاہتا ہے دل
دو صدیاں گزر گئی ہیں میں اب تک قفس میں ہوں

ایسا نہیں کہ رہرو راہِ نجات ہوں
یہ بھی نہیں کہ بندۂ مولا صفات ہوں
پھر کونسی ادا ہے جو آئی اُسے پسند
اسی برس سے قید بقید حیات ہوں

حلقہ احباب کے آخری دو رکن برق اور امین تھے۔ ان دونوں کا حال عجیب تھا۔ برق صاحب امین صاحب سے صرف چار ماہ بڑے تھے۔ دونوں اکٹھے بڑے ہوئے، ایک ہی دن ایک ہی سکول میں داخل ہوئے اور دوستی کا یہ عالم رہا کہ سالہا سال تک شب و روز کی ہمراہی رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ امین صاحب اپنا نام امین الحق اور برق صاحب اپنا نام حق الامین لکھا کرتے تھے۔ دونوں نے زندگی کے ہزاروں نشیب و فراز دیکھے۔ دونوں نے عسرتوں کا مقابلہ کیا، دونوں نے خوشحالی دیکھی۔ مگر دوستی میں کبھی سرِ موفرق نہ آیا۔ میں ان دو مرحوموں کی زندگی میں ۱۹۴۵ء میں داخل ہوا اور یہ اتحاد ثلاثہ ۵۸ سال تک برابر قائم رہا۔ میرے عزیز شاہد امین کا کہنا ہے کہ جب میں اور امین صاحب ٹیلیفون پر گفتگو کرتے تو وہ اس کی طوالت سے خود اندازہ کرتے کہ امین صاحب میرے ساتھ محو گفتگو ہیں۔ گفتگو ہمیشہ علمی ہوتی۔ دونوں بڑے باغ و بہار قسم کے لوگ تھے اور قریبی دوستی کے باوجود ہمارے درمیان شریفانہ وضع اور رکھ رکھاؤ قائم رہا۔ بے تکلفی میں بھی کبھی کوئی غیر مہذب لفظ ہماری زبان پر نہ آتا۔ دونوں مرحوم علمِ مجلس کے بادشاہ تھے اور گھنٹوں اپنی عالمانہ تقریروں سے اہل مجلس

کو محور کھتے اور کوئی بور نہ ہوتا۔ ان دونوں دوستوں نے دوستی کا حق ادا کیا، برق صاحب ۶، جون کو اللہ سے جا ملے۔ اتوار کا دن تھا۔ علالت کی وجہ سے امین صاحب کمزور تھے، مگر اپنے دوست کو الوداع کہنے آئے۔ آخری غسل دیتے وقت اُن کے نہلانے میں شریک ہوئے اور قبر پر مٹی ڈال دی۔ یہ سارا دن انہوں نے میرے ساتھ گزارا۔ جسمانی ضعف کے باوجود ذہن چالاک تھا۔ آغا عنایت علی صاحب کو سگریٹ پیش کیا، انہوں نے کہا میرے پاس ہے۔ امین صاحب نے فرمایا،

I DID NOT ASK YOU WHETHER YOU HAVE A CIGARETTE OR NOT, I OFFERED A CIGARETTE. YOU MAY ACCEPT IT OR NOT ACCEPT IT.

۸، اور ۹، جون کی درمیانی رات میں خود امین صاحب بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور میں اکیلا رہ گیا۔

جب آج سے ۱۳ سال پہلے میری بیوی کا انتقال ہوا تھا، تو میں نے کشمیری میں ایک رباعی لکھی تھی۔

دِس یلہ پگوٗمت پیہم نموٗ ہستی
اُچھن منز اوش چھُ ہوکمت ماتموٗ ہستی
کراں چھس صبح وشا مس، شام صبحس
دِوٗرِ کنہ بال چھس پراٹان نموٗ ہستی

لیکن تب ایک سہارا تھا کہ میرے احباب زندہ تھے، جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں آج ان میں سے کوئی باقی نہیں اور یہ سیاہ بخت ایک لق و دق صحرا میں یکہ و تنہا کھڑا ہے

اور انجام کا انتظار کر رہا ہے۔

ہر صبح ایک تازہ قیامت کی ہے نمود
ہر شام تیرہ بخت بزنگِ دل حسود
یہ روز و شب یہ شام دلپگاہ اور یہ ماہ و سال
اب تک میں جی رہا ہوں حوادث کے باوجود



تقریر از۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

ایک باغ و بہار شخصیت

خواجہ محمدؐ امین بچھ

محترم بزرگو، رفیقو، السلام علیکم

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

آج ہم مرحوم محمد امین بچھ صاحب کی یاد میں یہاں جمع ہوئے ہیں، اور یادوں کا ایک خزانہ ہے جو دل میں روشن ہو رہا ہے۔ میری خواہش یہ تھی کہ بچھ صاحب کے جیتے جی انکی شان میں کچھ ایسی ہی قسم کی ایک تقریب کا انعقاد ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا ذاتی طور پر مجھے رنج اور افسوس رہے گا، پھر بھی میرے لیے یہ باعث اطمینان ہے کہ اقبال اکیڈمی کے روح و رواں بشیر احمد نحوی نے بچھ صاحب کی یاد میں ایک شاندار جلسے کا اہتمام کیا ہے۔

کشمیر زرخیز خطہ ہے اور کتنے ہی بلند پایہ بزرگ شعراء، ادباء اور عالم دین یہاں پیدا ہوئے ہیں، اس وقت بھی اگر آپ نظر اٹھائیں تو ایک صف میں میر غلام رسول نازکی صاحب ہیں اور عارف صاحب ہیں۔ جو یقیناً اُفق کشمیر کے تابناک ستارے ہیں۔ میری ہمیشہ سے



امین صاحب اپنے فرزند مصباح انور کے ساتھ ۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

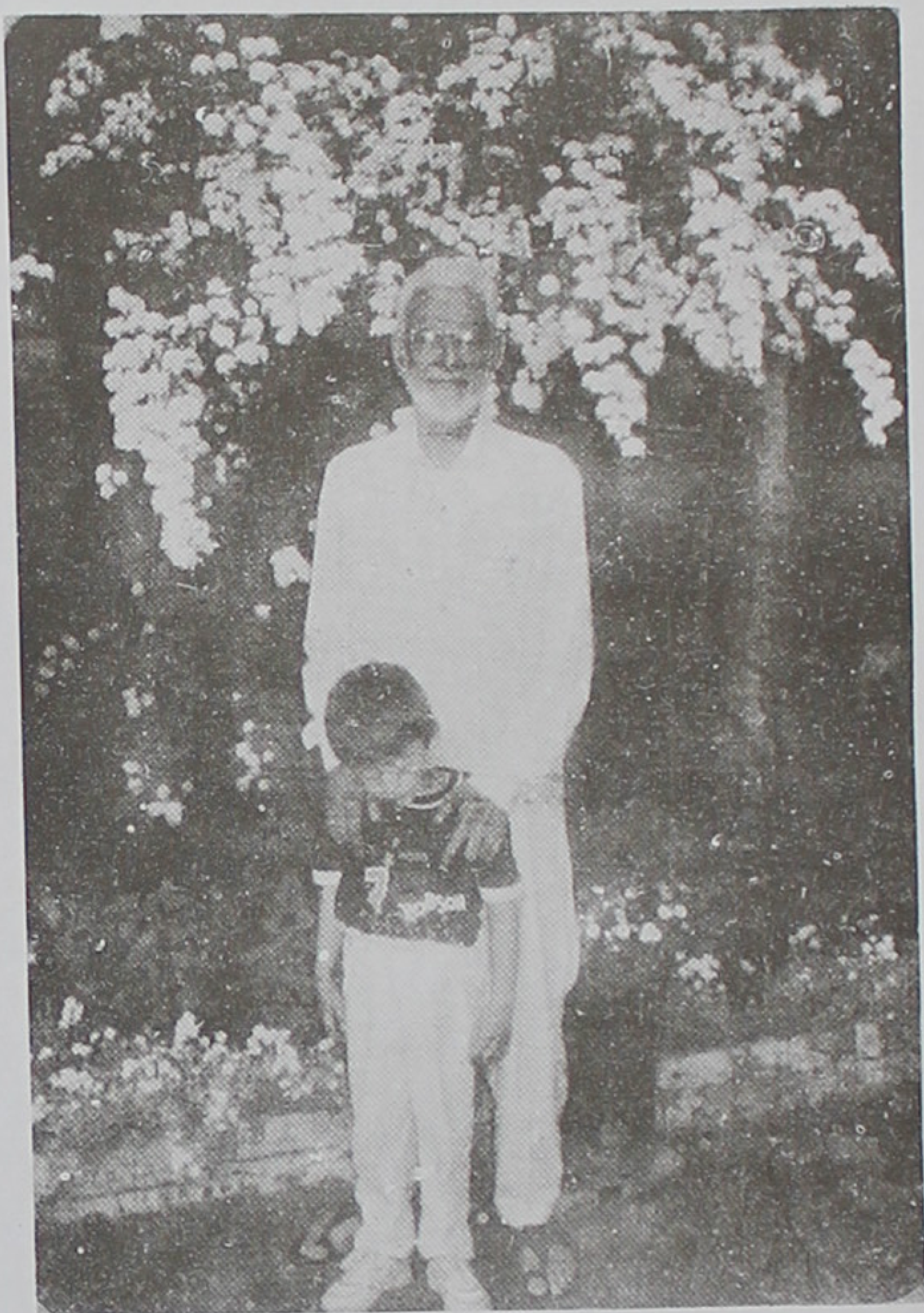
BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

یہ خواہش رہی ہے کہ ہمارے آسمان کے ان سورجوں کو ہم قریب سے دیکھیں، انکی حرارت اور روشنی کو دل کی گہرائیوں میں اُتاریں، چنانچہ اپنی محدود بساط کے مطابق کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام میں نے ان تابناک ستاروں پر تحقیق کا کام شروع کروایا۔ غ۔ م۔ طاؤس ہیں، رسا جاودانی ہیں، میر غلام رسول نازکی ہیں، شوریدہ کاشمیری ہیں اور شہ زور کاشمیری ہیں۔ ان حضرات پر پہلے ہی تحقیقی کام ہوا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ میں چاہتا تھا کہ جیتے جی انکو بلایا جائے اور ان کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ تخلیقی فنکاروں کے ساتھ ساتھ کشمیر میں ایسے بزرگ اور لائق و فائق ہستیاں بھی ہیں۔ جو علم دوست ہیں۔ جو ادب شناس ہیں، جو ادب نواز ہیں اور جن سے کشمیر کی علمی، مجلسی، دینی اور ادبی سرگرمیوں کو استحکام حاصل ہے۔ مرحوم محمد امین بچھ ایک ایسی ہی جلیل القدر ہستی تھی جنہوں نے زندگی کے ہر سانس کو علم و ادب کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ بے شمار یادیں ان سے وابستہ ہیں۔ میں ان ساری یادوں کو ان چند لمحاتِ گریزاں میں سمیٹ نہیں سکتا، لیکن ذاتی طور پر میں محسوس کرتا ہوں کہ محمد امین بچھ صاحب کی موت میرے لئے ایک سانحہ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بچھ صاحب ایک تناور اور سایہ دار چنار کی طرح تھے، جن کے سائے میں آدمی تھوڑی دیر کے لیے دم لیتا ہے، سستا لیتا ہے اور پھر تازہ دم ہو کر سرگرم سفر ہوتا ہے۔ چالیس۴۰ برسوں سے میں مرحوم کو جانتا ہوں۔ میں کالج میں میں بحیثیت لکچرر کے ۱۹۵۰ء میں متعین ہوا تھا۔ میرا پہلا مجموعۂ کلام چھپ چکا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ دیہات سدھار میں ایک بچھ صاحب ہیں اور وہ کتابیں خریدتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی ان سے ملوں۔ میں حاضر ہوا اور میں نے اپنی درخواست بھی پیش کی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ بچھ صاحب نے مجھے بغور دیکھا۔ میں کم سن تھا اور وہ ماشاءاللہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور معتبر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے مجھے چند روز کے بعد آنے کو کہا اور جب میں دوبارہ حاضر ہوا۔ وہ بے پناہ جذبۂ محبت سے ملے اور کہا کہ

میں نے آپ کا مجموعۂ کلام پڑھا ہے، یہ کتاب میں ضرور محلّے کے لئے خریدوں گا۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی۔ اس کم سنی کے عالم میں میری ایسی حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں شادماں اپنے گھر لوٹا۔

میں جواہر نگر میں سکونت پذیر تھا۔ میری ایک تنقیدی کتاب "غالب اور اقبال" چھپ چکی تھی۔ میں نے ایک کاپی مرحوم کو بھی پیش کی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شاید اتوار کا دن تھا۔ میں گھر پر ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو جناب محمد امین بچھ شانِ خسروانہ اور انداز کجکلاہانہ کے ساتھ باہر کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر انوار کا عالم تھا۔ میں سمجھا شاید یونیورسٹی کا کوئی کام ہوگا۔ انہوں نے اندر آتے ہی دل نوازی کے ساتھ مجھے گلے لگایا اور فرمایا کہ "میں نے ابھی ابھی آپکی کتاب پڑھ لی ہے اور ختم کی ہے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا، میں اتنا فاصلہ طے کر کے آیا تاکہ آپکو مبارکباد دوں اور اللہ گواہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، جس میں تازہ سنگترے تھے چنانچہ ایک سنگترہ کھولا اور فرمایا کہ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میرے ہاتھ سے اس کی دو قاشیں کھائیں گے۔ میری حیرانی کا اب کوئی اندازہ نہیں کہ میں نے کون سا تیر مارا تھا کہ ایسی پُروقار اور عالم و فاضل شخصیت میرے گھر تشریف لائے۔ میرے پاس الفاظ ہی نہ تھے کہ میں ان کا اس حوصلہ افزائی، اس علم دوستی اور ادب نوازی کا شکریہ ادا کرتا۔ آپ یقین کیجئے کہ میں بالکل پگھل کر رہ گیا اس شفقت اور بے پناہ محبت کے جذبے سے۔

بچھ صاحب کشمیر کی علمی اور ادبی مجلسوں میں اپنی حاضری اور بے پناہ جوش و خروش سے جان ڈال دیتے تھے۔ آخری ایام میں ان کی صحت کچھ اچھی نہیں رہتی، لیکن صحت کی خرابی ان مجالس میں شرکت کرنے سے انہیں کبھی مانع نہیں ہوئی۔ مجھے یاد آتا ہے اقبال اکیڈیمی کے جلسے ایام سرما ہوا کرتے تھے۔ اور کم سن لوگ یخ بستگی کے سبب کانپتے اور ٹھٹھرتے تھے، لیکن امین صاحب اپنے کجکلاہانہ انداز میں کالج آف ایجوکیشن



مُشفق دادا — شفقت بھرے ہاتھ اپنے پوتے پر
پھیر رہا ہے۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

. یا تاج ہوٹل کے باہر مہمانانِ گرامی کا انتظار کرتے تھے اور اس طرح اقبالؒ سے اپنی عقیدتمندی کا اظہار کرکے ایسی مجالس کو کامیاب بناتے تھے۔ بچھ صاحب کی وفات سے کشمیر کو ایک زبردست نقصان ہوا۔ کشمیر نے جن جیالے، شفیق اور سر بلند فرزندوں کو جنم دیا ہے۔ ان میں خواجہ محمد امین بچھ ایک قابل افتخار مقام رکھتے ہیں۔ کشمیر کی کونسی ادا انہیں پسند نہیں تھی۔ انہیں کشمیر کے ذرے ذرے سے پیار تھا اور وہ اس خطے کو ظلم و جبر سے آزاد دیکھنے کی تمنا کرتے تھے۔

مجھے امید ہے کہ اس پُروقار محفل میں ادیبوں اور شاعروں نے جو کچھ مرحوم محمد امین صاحب کے متعلق کہا وہ سب کچھ اقبال اکیڈمی کے اہتمام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آنا چاہیئے تاکہ آنے والی نسلیں امین صاحب کی پہلودار، باوقار اور باغ و بہار شخصیت سے متعارف ہو جائیں۔ مرحوم بچھ صاحب اقبال اکیڈمی کے رکن رکین تھے۔ یہ اکیڈمی کے ذمہ داروں کا کام ہے کہ "بیادِ شوریدہ" کی طرح "بیادِ محمد امین" ایک یادگار نمبر شاندار طریقے سے چھاپا جائے تاکہ کشمیر اپنے محسنوں اور معتبر ہستیوں سے بخوبی آگاہ رہے۔

پروفیسر غلام رسول ملک

صاحبِ دل

بعد از وفات تربتِ ما در زمین مہ جو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

اس جہانِ ظاہر پرست کی فریب خوردگیوں اور گمراہیوں میں ایک بہت بڑی فریب خوردگی اور گمراہی یہ ہے کہ یہاں شہرت کو عظمت کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ دو چیزیں ہم معنی ہیں؟ کیا عظمت کی حامل تمام شخصیات کو اس دنیا میں شہرت نصیب ہوتی ہے اور کیا جو شہرت پاتے ہیں وہ ہمیشہ ہی اور حقیقی معنوں میں عظیم ہوتے ہیں؟ یہاں بہت سے لوگ بالقوۃ عظمت (POTENTIAL GREATNESS) کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں لیکن بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کی عظمت قوت سے فعل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مؤرخ اور صاحب نقد و نظر انہی لوگوں کو جانچ پرکھ کر اپنے دفاتر میں محفوظ کرتے ہیں جو بالفعل کچھ کر سکتے ہوں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر مشہور شخصیت حقیقی عظمت کی حامل ہو یا ہر چمکتی چیز سونا ہو۔ سونا اکثر حالتوں میں زیر زمین مدفون رہتا ہے اور شاذونادر

ہی دستیاب ہوتا ہے۔

مرحوم خواجہ محمد امین کچھ ایسا ہی مدفونِ معدن سونا تھے جس کی قدر و قیمت سے ان کا زمانہ اور انکے معاصر غافل رہے۔ بالقوہ وہ ایک اچھے ادیب اور شاعر کا دل و دماغ لیکر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے ڈائریوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے اس کا ورق ورق اس بات کا شاہد ہے کہ سازگار حالات میں وہ دنیائے ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتے تھے۔ حالات و واقعات کے متعلق مختلف مواقع پر ان کا ردّ عمل، شخصیات کے متعلق انکی بے لاگ رائے، مختلف شعرا کے اشعار کا انتخاب اور کتابوں پر انکے مختصر اور جامع تبصرے اُن کی ڈائریوں کی زینت ہیں اور ان سب سے اُن کے اعلیٰ پایہ کے ذوق، انکی ادب شناسی اور انکے فطری تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ بلاشبہ اگر عہد طفولیت اور ایامِ شباب میں انہیں سازگار ماحول نصیب ہوتا اور اُنکی فطری صلاحیتیں مناسب طور پر پروان چڑھتیں تو وہ ایک اچھے ادیب ہوتے۔ کشمیر کی اردو صحافت میں اُن کا مختصر رول سعیِ اظہار میں مصروف ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ افسوس کہ صحافت کی دنیا میں وہ کچھ وجوہات کی بناء پر زیادہ دیر تک نہ ٹک سکے۔:

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

ان کے ساتھ گزری ہوئی صحبتوں اور اُنکی ڈائریوں کے توسط سے جس شخص صاحب سے ہمارا تعارف ہوتا ہے وہ حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ اور صاحب دل انسان ہے اور یہ دولتِ نایاب ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ وہ ہمارے گئے دنوں کے اُس اوّلین نصابِ تعلیم کے نمائندہ پروردوں میں سے تھے۔ جس کا اہم ترین ہدف انسانیت سازی ہوا کرتا تھا۔ ہمارا ماضی ہر اعتبار سے ہمارے حال سے بہتر نہیں تھا۔ سائینس اور فن میں اب ہم لوگ بہت آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن بچوں کی ابتدائی تعلیم و تدریس کے لحاظ سے ہمارے گئے دنوں کو آج کے دور پر یقیناً تفوق حاصل تھا۔ جس بچے کے ذہنی سفر کا آغاز سعدی و

عطاؔر کی روح پرور اور انسانیت ساز تعلیم کے ساتھ ہو اسے مادی دولت و حشمت کی چمک دمک اور متاع غرور کی طلسم کاری نہ کبھی مرعوب کرسکتی ہے نہ گمراہ۔ بچھ صاحب کے قلب وروح کی پرورش اسی تعلیم سے ہوئی تھی اور اسی کے طفیل وہ مدت العمر بلند پایہ اخلاقی وانسانی اقدار کے دلدادہ بھی رہے اور اپنی حدّ وسع تک ان کے پروان چڑھانے کی سعی بھی کرتے رہے۔

مرحوم بچھ صاحب کی سب سے زیادہ دلآویز خصوصیت تھی ان کا صاحبِ دل ہونا۔ جس چیز کو چاہا دل سے چاہا۔ جس کے ہوئے اسی کے ہو رہے۔ جس چیز کی دُھن کی اس کے لئے ہر صلاحیت وقف کی۔ وہ اُن دنیا داروں میں سے نہیں تھے جو ہر فیصلہ کرنے سے پہلے اس کے نفع نقصان کا حساب لگاتے ہیں۔ بلکہ فرزندانِ انسانیت کے اُس زمرے میں سے تھے جو مقصد کی خاطر آنکھ بند کرکے آگے بڑھتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ کود پڑنے سے پہلے اچھی طرح دیکھا کرو (LOOK BEFORE YOU LEAP) لیکن تاریخ کا رُخ متعین کرنے والے کون لوگ رہے ہیں، کودنے سے پہلے دیکھنے والے یا بلا جھجک کود پڑنے والے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل تو بود و نبود اور ہستی و نیستی کے پیچاک ہی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے ؎

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داد
از عشق ہویدا شُد ایں نکتہ کہ ہستم من

صاحبِ دل کا شیوہ عقل کی عیاریاں نہیں بلکہ عشق کی وارفتگیاں ہوتی ہیں۔

صاحبِ دل بچھ صاحب کا ایک محبوب بھی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے دل پسند شاعر کا نالۂ دردناک دل کے کانوں سے سنا تھا اور اسے اپنے رگ و پے میں اتار لیا تھا:

شبے پیشِ خدا بگریستم زار مسلمانان چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمے دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے نہ دارند

انہوں نے اپنے دل کے 'منہاں خانوں' میں اُس محبوب کو جگہ دی تھی جو اِس گذر گاہِ جلیلِ اکبر کے شایانِ شان ہے یعنی فخرِ موجودات، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ وہ معشوق ہے کہ جس کے عشاق کی صف میں شمولیت حاصل کرنا حیاتِ ارضی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ یہ وہ آقا ہے کہ جس کی غلامی معراجِ انسانیت کی آخری حد ہے۔ یہ وہ محبوب ہے کہ جس کی محبت، محبت کرنے والے کو کائنات کی سب ملکوتی قوتوں اور تمام سلیم الفطرت انسانوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیتی ہے۔ خود اقبال کو جو مقبولیت حاصل تھی اور ہے اُس کا باعث اُن کا بے پایاں عشقِ رسول ہے۔ بچھ صاحب کے عشقِ رسول کی کہانی میں نے بارہا اُن کے آنسوؤں کی زبانی سنی ہے۔ جب بھی کہیں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا تو وہ آبدیدہ ہو جاتے۔ ایک عظیم واقعہ انکی اکثر ڈائریوں میں شامل ہے۔ وہ یقیناً جانتے تھے کہ انکی کس ڈائری میں کیا لکھا گیا ہے اسی لئے اُن میں موضوعات کی تکرار نہیں ہے۔ مگر اس عظیم واقعہ کو وہ اکثر ڈائریوں میں بار بار نقل کرتے ہیں اور بصد شوق و ارادت اور بصد عشق و وارفتگی نقل کرتے ہیں اور اس واقعہ کا تعلق آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے ساتھ ہے ؎

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم*

واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کا ایک ملازم تھا جس کا نام محمد قلی تھا۔ اورنگ زیب اسے کبھی پورے نام سے پکارتے تھے اور کبھی صرف قلی کہکر آواز دیتے تھے۔ مصاحبین حیران تھے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن عالمگیرؒ کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ کسی نے کبھی اس بارے میں سوال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ آخر مشورے کے بعد طے پایا کہ یہ سوال

* سرمد کا یہ شعر خود بچھ صاحب کا انتخاب کردہ ہے اور انکی ایک ڈائری سے ماخوذ ہے۔

محمد قلی ہی سے کیا جائے۔ سوال کرنے پر محمد قلی نے بتایا کہ عالمگیرؒ اسے باوضو ہونے کی صورت میں پورے نام سے یاد کرتے ہیں اسلئے کہ محمدؐ اسکے نام کا ایک جز ہے لیکن جب ان کا وضو نہیں ہوتا تو صرف قلی کہہکر بلاتے ہیں اسلئے کہ انہوں نے عمر بھر کبھی بھی اسم گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنا وضو کے زبان پر نہیں لایا ہے۔ اسکے علاوہ ہر ڈائری میں مختلف نعت گو شعراء کے چیدہ چیدہ نعتیہ اشعار زیب قرطاس بنائے گئے ہیں۔ کہیں جامی و سعدی کی مدحت طرازی کے دلکش نمونے ہیں تو کہیں امیر مینائی اور ظفر علی خان کی زمزمہ سنجی کے۔ کہیں غالب کا اظہار عقیدت ہے تو کہیں اقبال کی دلگداز نواخوانی۔ کہیں عبدالاحد نادم کا نغمۂ شوق نظر آتا ہے تو کہیں حقانی کی پُرشکوہ مدح سرائی۔ بچھ صاحب بڑے شعراء پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ جہاں، جس شاعر کی کوئی اچھی نعت ملی یا کوئی اچھا نعتیہ شعر ملا سب ڈائری کی زینت بناتے چلے جاتے ہیں اور بزبان حال دربار محبوب کی طرف پکارتے جاتے ہیں ؎

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو

مجھے یقین ہے کہ بچھ صاحب کی ڈائریوں سے فارسی، اردو اور کشمیری نعتیہ شاعری کا بہترین انتخاب اخذ کیا جاسکتا ہے۔

سلمان رشدی ملعون کی کتاب 'THE SATANIC VERSES' جو ادبی نقطۂ نگاہ سے اس توجہ کی ہرگز ہرگز مستحق نہیں جس سے دشمنِ اسلام مغرب نے اسے نوازا جب شائع ہوئی تو پورے عالم اسلام میں ایک تہلکہ بپا ہوا۔ عاشقان رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم زخمی روحوں اور خونناب آنکھوں کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے گھروں سے نکل آئے۔ آیت اللہ خمینی مرحوم نے شاتم رسول رشدی کو واجب القتل قرار دیا اور پورے عالم اسلام میں مومن اہل قلم اپنی متاعِ فکر و سخن اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں نچھاور کرنے کیلئے آگے آئے اور دنیا نے پھر ایک بار وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کے عملی تفسیر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ اس موقعہ پر بچھ صاحب نے



وہ مقدس مقام جہاں سرورِ کائنات، فخرِ موجودات محمد مصطفٰےؐ نے آخری خطبہ فرمایا تھا۔
امین صاحب یہاں دست بدعا ہیں۔

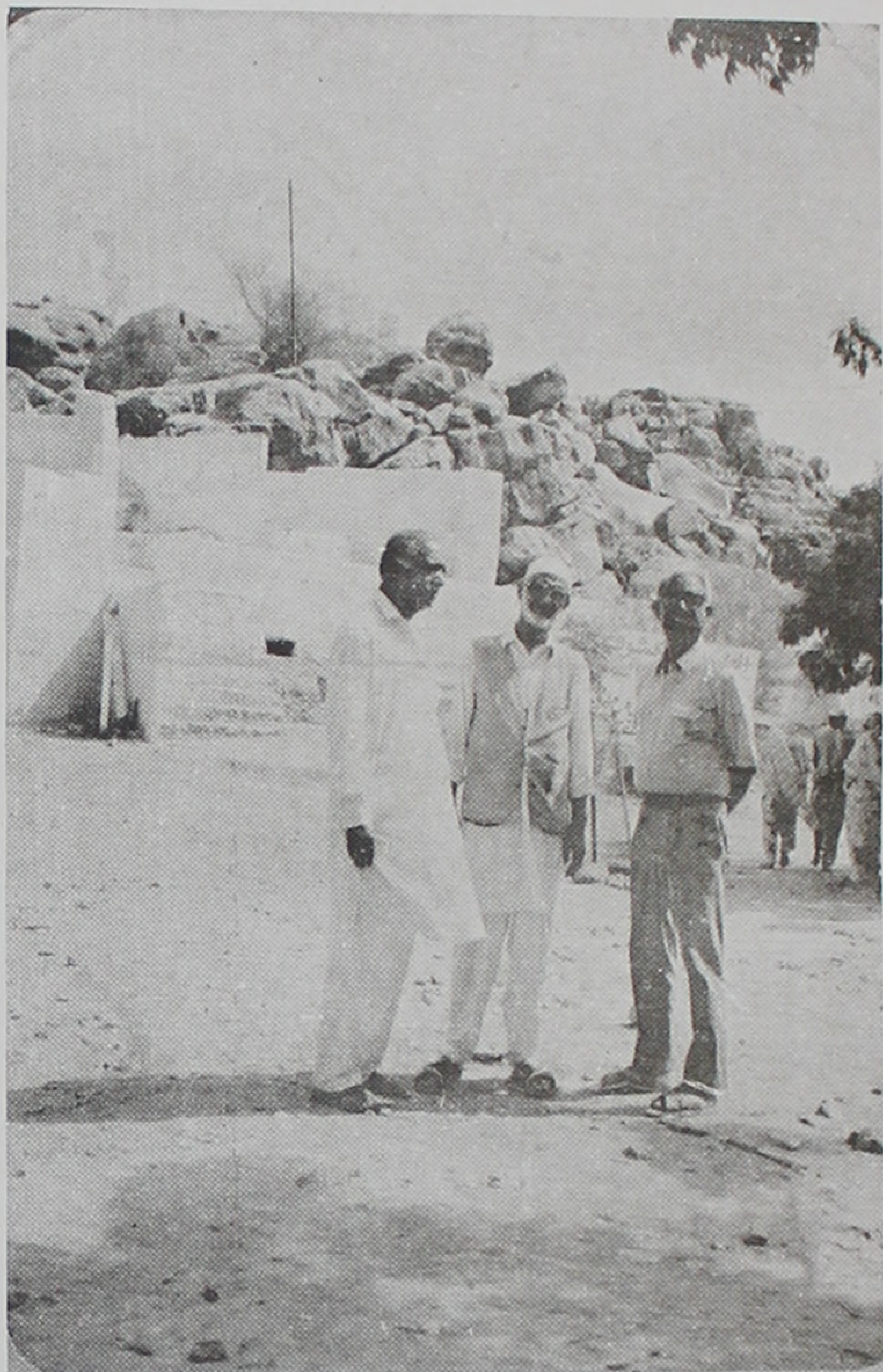
Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



امین صاحب سرزمین حجاز میں جس کے سنگریزوں پتھروں اور مٹی کے ذروں سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

بھی اپنی عقیدت اور عزت وحمیت کا مظاہرہ کیا اور خاص طور پر لکھنے والوں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ وہ جہاں کہیں انگریزی میں لفظ محمدؐ لکھیں تو اسے اسکی پوری اسپلنگ کے ساتھ لکھیں اسلیئے کہ Mohd. کو اور طریقوں سے بھی پڑھا جاسکتا ہے جس کی جانب ایک مذموم کوشش رُشدی ملعون نے بھی کی ہے۔ انگریزی میں محمدؐ کا صرف ایک تلفظ درست ہے۔

MUHAMMAD

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

محمد کے شیدائیوں نے رشدی ملعون کی کتاب کے جواب میں جو کچھ کہا، لکھا یا کیا خود اپنی فلاح و نجات کے لئے کیا ورنہ جس ہستی کو اس کے بدترین دشمن بھی تاریخ کا سب سے بڑا انسان ماننے پر مجبور ہوتے ہوں۔ جس کی نعت خوانی خود خدا اور اس کے ملائکہ کرتے ہوں۔ جسے خود خالق کائنات نے محبانہ شان کے ساتھ دائمی رفعِ ذکر کا مژدہ سنایا ہو اور اس رفع ذکر کی گونج تاریخ کے ہر لمحے میں سنائی دیتی ہو اسے ایک ناپاک آدمی کی متعفن تحریروں سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نامِ پاکِ محمدؐ تو وہ نام ہے کہ انسانی روح کی گہرائیوں سے لے کر کائنات خلقت کی پہنائیوں تک ہر ذرّے پر ثبت ہے:

خیمہ افلاک کا اِستادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنالک ذکرک دیکھے

اللہ بچہ مرحوم کو اُنکی محبت رسولؐ کے صدقے کروڑ کروڑ جنت نصیب کرے۔

دنیا کے بڑے انسانوں کو ایک اعتبار سے تین اقسام پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ کہ جن سے آدمی مرعوب ہوتا ہے اور اپنے اور انکے درمیان از خود فاصلہ قائم کرلیتا ہے۔ ایسی شخصیتیں ہمارے اندر احترام کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی عظمت مرعوب کن بھی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کا ہر نقش دلآویز بھی ہوتا ہے۔ انکے سامنے جہاں انسان کی گردن احترام و عقیدت کے ساتھ خم ہو جاتی ہے۔ وہیں دل والہانہ طور پر ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ ہمارے اندر احترام، عقیدت، محبّت اور اس سے آگے اطاعت و انقیاد کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں کا تعلق اسی زمرے کے ساتھ ہے۔ تیسری قسم کی شخصیات نہ تو مرعوب کُن ہوتی ہیں اور نہ شاید ہمارے اندر اطاعت و پیروی کا جذبہ پیدا کرسکتی ہیں مگر دل کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیتی ہیں کہ آدمی ان سے بے اختیار محبت کرنے لگتا ہے۔ اس قسم کی شخصیات میں جو جاذبیت اور مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد نہ تو جسمانی قوت و طاقت پر ہوتی ہے اور نہ علم و عمل کی غیر معمولی صلاحیتوں پر۔ فکر و عمل میں وہ شاید کوئی مثالی نمونہ بھی نہیں ہوتے مگر وہ دردِ دل کی دولت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، وہ دردِ دل کہ جس کے سامنے سارا علم اور فلسفہ ہیچ نظر آتا ہے۔:

یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

اسی دردِ دل کی بدولت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے دربارِ دُربار میں امیر خسرو کو وہ منزلت نصیب تھی کہ بڑے بڑے زہّاد و اتقیا اس پر رشک کرتے تھے۔ خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ جب قیامت کے روز اللہ مجھ سے سوال کرے گا کہ "نظام الدین، کیا ساتھ لائے ہو؟" تو میں عرض کروں گا "امیر خسرو"۔ کئی بار، دعا کرتے وقت خواجہؒ نے خود اس راز سے پردہ اٹھایا کہ خسرو کی اس مقامِ بلند تک رسائی اُسکے سوزِ دل کے واسطے سے ہوئی تھی بڑا شاعر اور فن کار ہونے کی وجہ سے نہیں، جو وہ بے شک تھا۔ خواجہؒ جب دعا فرماتے تو خسرو کی

طرف اشارہ کر کے کہتے "اے اللہ، اس ترک کے سوزِ دل کے طفیل میں میری مغفرت فرما۔"
بے شک اللہ کی میزانِ قدر میں سب سے زیادہ وزنی چیز ایک ٹوٹا ہوا دل ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَموالِکُمْ وَلٰکِن یَّنْظُرُ اِلٰی قلوبِکُمْ وَ اَعمالِکُمْ۔ اُس کی جناب میں وہی بار پاتا ہے جو پگھلا ہوا دل لے کے آتا ہے۔ دل وہ آئینہ ہے۔

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

مرحوم بچھ صاحب بھی انہی قلیل التعداد لوگوں میں سے تھے جو دردِ دل کی دولت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں بار بار نہیں آتے اور جب آتے ہیں تو اپنے دامن میں مجروح قلوب وارواح کے لئے مرہم لے آتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو ہزاروں آنکھوں کو اشکبار چھوڑ جاتے ہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں انکی صحبت نصیب ہوئی تھی۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اس سرزمیں سے مہرووفا کون لے گیا

فروغِ شمع تو باقی رہے گا محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

اللہ کی ذات کے سوا ہر شئے فانی اور آنی جانی ہے۔ اِحتیاج اور فنا مخلوق کی صفت ہے۔ انسان یقیناً خلاصۂ کائنات اور اشرف المخلوقات۔ مگر وہ ضعیف البیان بھی تو ہے۔

کریں کیا اپنی ہستی کا یقین ہم
ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں ہم

جس جان کے لیے تقدیر کے قاضی نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں کمی بیشی ممکن نہیں، ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔۔ مگر

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے
ورنہ جو سانس ہے پیغام فنا دیتا ہے

پیغام فنا سے اس دنیا میں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں، جو اپنے پیچھے اعمال صالحہ اخلاق حمیدہ اور

اوصاف ظاہرہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ جن کے دل مروت و محبت اور شفقت و مودت کے جذبات سے لبریز ہوا کرتے ہیں۔

آج ہم ایک ایسی ہی محترم شخصیت مرحوم محمد امین بچھ کا یہاں ذکر خیر کر رہے ہیں۔ جو گوشت پوست کے ایک مجسمہ اور ایک پیکر کا نہیں بلکہ ماضی کی شاندار قدروں کے ایک امین، ایک اصول حیات، ایک زاویۂ فکر کا نام تھا۔ جسدِ خاکی ہمارے درمیان سے اٹھالیا گیا کہ یہ قانون فطرت ہے، بقول شاعر ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

مگر جانے والے کی زندگی کی شاہراہ میں اس کے نقشِ پا صاف نظر آ رہے ہیں۔ شمع علم و ادب کا یہ پروانہ اس وقت بھی میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔

مرحوم خواجہ محمد امین بچھ کا تعلق اس خاندان سے ہے جس کے اکثر افراد اعلیٰ علمی اور انتظامی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہیں۔ اردو کے مشہور ادیب قدرت اللہ شہاب نے پاکستان کی سیاسی، تہذیبی، سماجی اور ادبی تاریخ "شہاب نامہ" جو تقریباً ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب ہے، میں امین صاحب کے برادرِ صغیر جناب محمد یوسف بچھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یوسف بچھ صاحب واحد پاکستانی ہیں جو ذاتی اہلیت اور لیاقت سے اقوام متحدہ میں اپنی جگہ پیدا کر سکے"۔ انگریزی زبان پر انکی قدرت کاملہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، کہ اہل زبان انکی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چند سال پہلے وہ اپنی والدہ کی وفات کے موقع پر یہاں تشریف لائے تھے۔ وہ برزلہ باغات میں اپنے بھائی غلام نقشبند بچھ سابق چیف کنزرویٹر فارسٹ کے مکان میں ٹھہرے تھے۔ چنانچہ امین صاحب کے توسط سے مظہر امام صاحب اور میں انکی خدمت میں حاضر ہو کر تین گھنٹے تک سیاست، ادب، شعر اور امریکی زندگی کے موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ اس گفتگو کے دوران نقشبند صاحب

دوبار محفل سے اجازت مانگ کر چلے گئے۔ ہم نے جب معلوم کیا کہ نقشبند صاحب کہاں چلے گئے۔ تو بتایا گیا کہ نماز باجماعت کے یہ سختی سے پابند ہیں۔ فارسی کی ضرب المثل ہے۔

ع ایں خانہ تمام آفتاب است

اور مرحوم بچھ صاحب کے گھر پر یہ مصرعہ من وعن صادق آتا ہے۔

امین صاحب کی دوستی، مراسم، اور تعلقات کا معیار علم وادب اور شعر وسخن تھا۔ وہ جہاں کہیں اور جس کسی کے پاس ان خوبیوں میں کوئی ایک خوبی دیکھتے تو فوراً اسکی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ ان سے میری شناسائی ۱۹۸۱ء سے ہے۔ اُن دنوں اخبار آفتاب میں میرے مضامین کثرت کے ساتھ چھپتے رہتے تھے۔ پطرس کاشمیری، اور ب۔ احمد کے فرضی ناموں سے بھی سیاسی ڈائریاں اور تجزیے شایع ہوتے رہتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ پروفیسر وحیدالدین ملک، پروفیسر حاجنی مرحوم، مرزا غلام قادر بیگ مرحوم، غلام محمد میر طاؤس مرحوم، ڈاکٹر نصیر احمد شاہ اور پروفیسر حامدی کاشمیری کے انٹرویو تصاویر کے ساتھ اخبار کی مختلف اشاعتوں میں شایع ہو گئے۔ میں اخبار کے دفتر سے باہر آرہا تھا کہ برآمدے پر ایک پُروقار شخصیت نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھایا اور فرمایا۔ "آپ بشیر احمد نحوی ہیں۔" میں نے کہا ہاں۔ کہا میں آپ کا ماتھا چومنا چاہتا ہوں۔ ماتھا بھی اور میرا ہاتھ بھی چوما اور فرمایا کہ آپ میرے ساتھ آئے۔ چنانچہ کراون ہوٹل متصل گھنٹہ گھر میں مجھے لے گئے۔ خورد ونوش کے لیے آرڈر دے دیا چنانچہ یہ پہلی ملاقات ایک گھنٹے تک رہی اور میں ان کی معلومات، علم وادب سے ان کے گہرے تعلق سے زبردست متاثر و محظوظ ہو گیا۔ اب ہم بار بار ملتے رہے۔ ۹۔ نومبر ۱۹۸۶ء کو میں نے ادیبوں، شاعروں اور فکر اقبال کے شیدائیوں کا ایک شاندار جلسہ تاج ہوٹل میں بلایا اور اقبال اکیڈمی کی بنیاد ڈال دی۔ سردی کا موسم تھا لیکن پہلا شخص جو ہوٹل کے نچلے دروازے پر مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا وہ مرحوم بچھ صاحب تھے۔ چنانچہ ۲۳۔ نومبر ۸۶ء، پھر ۲۵۔ دسمبر ۸۶ء کو سخت سردی کے ایام میں اقبال اکیڈمی

کے اجلاس ہوتے رہے اور کچھ صاحب سردی میں منعقد ہونے والے ان جلسوں میں کہتے رہتے تھے کہ اقبال نے اس بوڑھاپے میں مرزا عارف اور میرے جسم کے اندر جوانی کی تازگی اور گرمی پیدا کردی ہے۔ امین صاحب کے انہماک، جوش و خروش اور حوصلہ افزائی نے میرے لئے مہمیز کا کام انجام دیا۔ ۱۹۸۸ء میں ایک بار ایک ڈیڑھ مہینے تک ملاقات نہ ہو سکی، ۲۶، نومبر ۸۸ء کو ای "دلکشا" سے میرے نام خط لکھا جس کی چند سطور نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امین صاحب رقمطراز ہیں :-

"میرا دل ہمیشہ موہ لیا ہے دو قسم کے اصحاب نے،

ع روشن ضمیر پیرے یا خوب رو جوانے

روشن ضمیر پیر، میرے پیر و مرشد قبلہ مولانا شمس الدین حیرت کاملی نے میرا دل موہ لیا تھا۔ اب انکی یاد میرے دل کی قوت کی ضامن ہے۔ آپ عشق و محبت اور شعر و سخن کی وادی میں ایسے سرگرم جادہ پیما تھے کہ منزل مقصود کو آپ نے جس طور جا لیا، بڑے بڑے عشاق کو اس پر رشک ہوا۔ وہ اس مسلک طریقت اور سلسلۂ جنوں کے ساتھ منسلک تھے جس کے نام آور ہیرو بایزید و جنید اور فرہاد و مجنون تھے۔ خود فرمایا ؎

آں صاف سفالستم در کسوتِ مینائی
صد آتشِ مے دیدم میخانہ بہ میخانہ
جائے کہ ودیعت بود اندر جگر حیرت
فرہاد ز مجنون یافت دیوانہ ز دیوانہ

اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔

خوب رو جواں عزیز القدر بشیر احمد نحوی ہیں جس نے میرا دل موہ لیا ہے۔ وہ علم و فضل کی وادی کے ایسے جادہ پیما ہیں کہ ایک اونچے زینۂ فضل پر فائز ہو رہے ہیں۔ مجدد وقت علامہ اقبال کو نور بصیرت بقدر تمام حاصل ہوا تھا۔ کیسے۔ صرف لا الٰہ الا اللہ پر ایمان کامل

اور عشق محمدیؐ کا مکمل فدائی ہونے سے۔ ایسے مکمل عشق سے کہ وہ بڑے ایمان والیقان سے کہہ اٹھا۔

ے قوتِ قلب وجگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

اقبال نے دعا کی

ے خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کردے

یہ دعا مستجاب ہوئی اور بشیر احمد نحوی جیسے جوان معرض وجود میں آئے۔ جن کا دل اقبال کی آہ سحر اور اس کے نور بصیرت سے زندہ و منور ہے۔"

یہ سال گذشتہ کی ہی بات ہے کہ مرحوم امین صاحب دہلی تشریف لے گئے۔ پانچ ماہ کے طویل عرصے کی جدائی۔ واعظ صاحب کے دفتر تشریف لائے۔ ایک مختصر سی پرچی لکھ کر رکھ دی تھی۔

"عزیزی واعظ صاحب !۔ اس وقت سوا تین بجے ہیں۔ آج دوسری مرتبہ حاضر ہوا۔ شوق ملاقات بڑا شدید ہے۔ آپ صدر دفتر پر گئے ہیں۔ باہر بارش اور دھوپ بیک وقت جلوہ افگن ہے۔ میں نے تھوڑی دیر یہاں انتظار کیا اس امید سے کہ آپ رونق افروز ہونگے۔ عزیزی بشیر احمد نحوی کے لئے دل تڑپ رہا ہے۔ اب ان سے ملے پانچ ماہ کا طویل عرصہ ہوا اور

؏ دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

اب میرے یونیورسٹی جانے کے سوا چارہ ہی نہیں، تاکہ ان سے مل سکوں۔ ورنہ زندگی کا کیا بھروسہ۔

نیاز آگین
امین ــــ ۴، مئی دوشنبہ ۱۹۹۲ء



؎ نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

Title ______________________

Author ______________________

Accession No. ______________________

Call No. ______________________

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



ساٹھ سال سے انگریزی اور اردو اخبارات کا باقاعدہ قاری۔ اہم سیاسی اور ادبی واقعات کے اخباری تراشے ہزاروں کی تعداد میں ان کے پاس محفوظ ہوتے تھے۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ مرحوم امین صاحب علم دوست اور ادب پرور تھے اور ان سے دوستی نبھانے کا ایک ہی معیار اور وہ تھا علم و ادب۔ خاندانی شائستگی، شرافت و نجابت اور وقار و متانت کے جملہ اوصاف کے ساتھ وہ جب کسی کے ساتھ الجھتے تھے تو بہت ہی سخت اور فولادی مزاج کے ثابت ہو جاتے تھے۔

مرحوم مفتی جلال الدین صاحب ایک عالم و فاضل تھے۔ خانقاہ معلیٰ کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔ امین صاحب جمعہ کی نماز اکثر خانقاہ عالیہ میں پڑھا کرتے تھے۔ خانقاہ کے متصل ایک مسجد تعمیر کی گئی جس کے دروازے پر مفتی جلال الدین مرحوم نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کے بجائے باسمہٖ ذی الجلالِ وَالضیاء لکھوایا۔ امین صاحب نے اخبار میں اس پر پہلے اعتراض کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ یہ جملہ نہ منصوص ہے اور نہ ہی مسنون۔ مفتی صاحب پہلے مرحلے پر مدافعت کے لئے سامنے آ گئے، کئی کتابوں کے حوالے پیش کئے۔ لیکن مرحوم بچہ صاحب اپنے موقف پر ڈٹے رہے، چنانچہ گرما گرمی اور بحث مباحثہ کی صورت حال میں مفتی صاحب نے کوئی کڑوا جملہ امین صاحب پر کسا۔ امین صاحب غصے میں آ گئے اور جوابی حملہ کیا اور کہا آپ نے مسجد پر یہ جملہ اس لئے کندہ کروایا کیوں کہ آپ کا نام "جلال" ہے اور آپ کے باپ کا نام "ضیا" اور حقیقت بھی یہی تھی کہ مفتی صاحب کے باپ کا نام ضیاء الدین تھا۔ بہر حال مفتی مرحوم کے تمام دلائل امین صاحب کے زور استدلال کے سامنے کمزور پڑ گئے اور مسجد میں نصب شدہ پتھر کو ہٹایا گیا اور اس پر باسمہٖ ذی الجلال والضیاء کے بجائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر کروایا۔ اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد جہانگیر چوک میں ملے اور اقبالؒ کے یہ اشعار زور زور سے پڑھنے لگے:

بیا تا کار ایں امت بسازیم | قمار زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر | کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

شاتم رسول سلمان رشدی کی کتاب SATANIC VERSES پر جب ہر طرف شور و غل

پچ گیا تو امین صاحب نے اس موقع پر اخبارات میں عوام سے اپیل کی کہ انگریزی میں لفظ محمدؐ کو MOHD مخفف لکھنے کے بجائے پورے حروف MUHAMMAD کے ساتھ لکھا جائے MOHD لکھنا انگریزوں کو پسند ہے کیوں وہ اس نام سے خائف ہیں، اس لیے خاکم بدہن وہ فی الحال اسکی لفظی صورت بدلتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ امین صاحب لفظ محمدؐ اور احمدؐ پر ہمیشہ "ص" لکھا کرتے تھے۔ اور اپنے محبوب پیغمبر سے اپنی عقیدت، محبت اور نسبت کا اظہار کبھی آنسوؤں سے اور کبھی شعراء کے اشعار دہرانے سے کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہم اقبال اکیڈمی کے دفتر گوگجی باغ جا رہے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کا ذکر مسعود ہوا کہ امین صاحب رونے لگے۔ ان کا گلا رندھ گیا اور عزت بخاری کا شعر وردِ زبان کیا

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

زیارت بیت اللہ سے واپسی پر ایک ملاقات میں فرمایا کہ میری دیرینہ تمنا تھی کہ روضۂ رسولؐ کی جھالی کے ساتھ اپنا ماتھا رگڑوں۔ یہ موقعہ جب طویل انتظار کے بعد آپہنچا مگر روضۂ اقدس کے خدام نے اسکی اجازت نہیں دی۔ میں آہستہ آہستہ پولیس مین کے کان کے نزدیک گیا اور عربی میں ایک شعر پڑھا۔

اِذْهَبْ اَيُّهَا الزَّاهِدُ
مَذْهَبُ الْعِشْقِ مَذْهَبٌ وَاحِدٌ

پولیس والا قدرے نرم پڑگیا۔ میرے چہرے کی حالت دیکھ کر اس نے جھالی کے نزدیک جانے کی چند ایک لمحوں کی اجازت دی اور میری دلی تمنا پوری ہوگئی۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

مجالس شعر و ادب میں مرحوم امین صاحب اچھے اشعار پر داد و تحسین دیتے، شاد باد، آفرین،

دہنت تنکر بباید' اللہ اکبر مرحبا وغیرہ کہکر محفل میں گرمی کا ماحول پیدا کرتے تھے۔ گذشتہ سال "یوم اقبال" کے موقعہ پر امین صاحب نے مسلسل کئی سگریٹ پیئے۔ اس پر ایک NON-SMOKER امین صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ بجھ صاحب "اقبال کی محفل میں سگریٹ پینا مناسب نہیں!" امین صاحب نے فوراً حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ خود اقبال پیتے اور خوب حقہ پیتے تھے۔ LIGHTER نکالا۔ سگریٹ جلایا اور اپنی کجکلاہی پر قائم رہے۔ مجروح کا شعر ہے۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سوز تن کے ساتھ — اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

حضرات :-

میں آپ کے اور دیگر مقررین کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا ہوں۔ آخر میں جناب مرحوم امین صاحب کی رُوحِ پُر فتوح کو اشکبار آنکھوں اور سوگوار آہوں سے عقیدت کا سلام اور محبت کے پھول نذر کر رہا ہوں۔

مرے قلم کی نوائیں سلام کہتی ہیں — دھڑکتے دل کی صدائیں سلام کہتی ہیں
ادھر بھی دیکھ، نگاہوں کو پھیرنے والے — کہ یہ اُداس فضائیں سلام کہتی ہیں
وہ بے شمار شگوفے کہ ہیں رہینِ خزاں — اُنہیں چمن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
وہ سجدہ ہائے ارادت برنگِ آہِ سحر — وہ نیم شب کی دعائیں سلام کہتی ہیں
روش روش کی زباں پر ہے عرضِ ناز و نیاز — چمن چمن کی ادائیں سلام کہتی ہیں

ترے لیے یہ عقیدت کے پھول حاضر ہیں
قبول کر کہ وفائیں سلام کہتی ہیں

محمد امین بچھؔ

ــــــ میرے برادرِ محترم

عمر کا اچھا خاصہ فاصلہ ہمارے بیچ میں تھا۔ وہ مجھے برادر عزیز لکھا کرتے تھے اور میں اُنہیں اُخی المکرم یا برادر محترم کے الفاظ سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بیس پچیس برس بزرگ تھے۔ لیکن اپنی عمر کے آخری ایام میں وہ مجھ سے اتنے گھل مل گئے تھے کہ ہمیں آپس میں کوئی دوری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ ہم گویا یک جان دو قالب بن کر رہ گئے تھے۔ قریب ترین پڑوسی ہونے کے علاوہ خانگی لحاظ سے بھی ہماری قربت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دو یوم کی دوری کا احساس بھی تکلیف دہ بن جاتا تھا۔ ہر روز آپسی ملاقات نہ ہوتی تو ٹیلی فون رابطہ قائم کرتے اور کبھی وہ ناسازیٔ طبیعت کے سبب کُنج نشینی یا بستر علالت پر دراز ہونے کے لئے مجبور ہو جاتے تو بھی کم از کم رُقعہ لکھ کر میرے ساتھ رابطہ قائم رکھتے اور اس طرح ترسیلِ سخن و گفتگو اور ہم خیالی اور مشترکہ اظہارِ قلم کا یہ سلسلہ اُنکے آخری دم تک قائم رہا۔

میرا یہ تذکرہ برادر اکبر محمد امین بچھ کے بارے میں ہے۔ افسوس کہ آج انکے نام کے ساتھ

لفظ متوفی لکھنا پڑتا ہے۔ مرحوم اور مغفور تو وہ ہیں ہی۔ پھر بھی اللہ سے دعا ہے کہ انہیں غریق رحمت کرے اور انکی قبر نورانی بنی رہے ؎

امانت کی طرح رکھے زمیں روزِ محشر تک ۔۔۔ نہ اک مُو پیرہن بگڑے نہ اک تار کفن بگڑے

مرحوم کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ماشاءاللہ سبھی جوان ہیں اور لائق وفائق بھی، سب سے چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ مرحوم کو خاص درجہ لگاؤ اور اُنس تھا۔ معلوم ہوا کہ امین صاحب مرحوم کی وفات کے چار یا پانچ ماہ بعد عالم خواب میں وہ اسی چھوٹی بیٹی کے پاس آئے اور کہا کہ میں ایک مضمون مرتب کرنے میں مصروف ہوں، جو اخبارات میں وسیع تشہیر کے لیے شایع ہوگا۔

رویائے صادقہ کا عالم کچھ عجیب و غریب ہوتا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ وہی مضمون تو نہیں۔ جو مرحوم اور راقم الحروف نے مشترکہ طور قلمبند کیا تھا اور جو انکی وفات سے صرف دو ماہ قبل سرینگر کے مقامی روزنامہ ندائے مشرق مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۹۳ء کو شایع ہوا تھا۔ ☆

افکارِ پریشان

(خواجہ محمد امین بچھ کی وفات سے تاثر لے کر)

برسوں وہ ہمارے درمیان رہے۔
گوناگوں رنگوں والے کنول کی مانند، خوشبو سے لبریز وہ مہکتے رہے اور بلبل ہزار داستان
کی طرح چہکتے رہے
پھر اچانک وہ گھڑی آگئی جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئے۔
اور سب نے کہا
"وہ سفرِ آخرت پر، نور کی منزلوں کی طرف روانہ ہوئے۔"
اور ان کے جانے سے میرے دل پر ایک گہرے زخم کا نزول ہوا۔
اور میں سوچنے لگا
یہ موت کیسی چیز ہے
بہتا ہوا دریا کیسے ایک دم تھم جاتا ہے
شوخیٔ گفتار، مستیٔ کردار اور حرف و صوت کے جادوگر کیوں اور کیسے بے بس ہو جاتے ہیں

تصورات اور تخیلات کے عمیق ساگر کیسے از خود جم جاتے ہیں۔
اور اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن پر اہل دانش کا ورود ہوا
ایک نے کہا
"زندگی ایک معمہ ہے۔ دیوانے کا خواب جو نہ سمجھا جائے نہ سمجھایا جا سکے۔"
دوسرے نے کہا
"زندگی عناصر کا ظہور ترتیب ہے اور انہی اجزار کا انتشار موت ہے۔"
مگر میں مطمئن نہیں ہوا
پھر شاعر مشرق نے کہا

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا — تیرے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہدوں — وجود حضرت انسان نہ روح ہے نہ بدن

اور ان افکار سے بھی میری تسلّی نہ ہوئی
پھر مجھے میرے مرشد کے فرمودات یاد آئے وہ کہتے تھے۔
"مت کہو کوئی مر گیا۔ وہ تو صرف اُس غلاف سے الگ ہو جاتا ہے جس میں وہ لپٹا ہوا تھا۔"
یہ سب سن کر میں نے سمجھا کہ موت اور حیات ایک ہی جڑواں مخلوق ہے۔ باہم مربوط اور پیوست جیسے برف کی سِل۔ پگھلے تو پانی نذوق رفتار لئے حیات، حرکت اور حرارت سے بھرپور۔ اور جم جائے تو مادۂ منجمد حرارت اور حرکت سے محروم، گویا موت قلب حیات میں مستور ایک دفینہ ہے۔ ایک کھُلا ہوا راز۔ اتنا ہی راز جسقدر کہ زندگی ہے۔ جیسے بیداری اور خواب۔
میں نے ایک نگاہ اُن کی میّت پر ڈالی جو ابدی خاموشی کے حریری لباس میں لپٹی پڑی تھی اور میرا تخیل مجھے بہت دُور لے گیا اور میں سوچنے لگا۔
ابھی ابھی ان کی سانسوں کا مدو جزر ان کے سفینۂ حیات کو بسیطِ ابد کی جانے کونسی

منزلوں کی طرف رقصاں لے گیا اور ہم اس مد و جزر کے رقص و موسیقی کو نہ دیکھ سکے نہ سُن سکے کیونکہ ہماری مثال اس دلہن کی سی ہے جس کا گھونگھٹ ابھی اُترا نہیں لیکن وقت ضرور آئیگا جب ہمارا سرتاج ہمارا مالک ہمارا گھونگھٹ اتار دیگا اور اس روز ہم بے نقاب ہو جائینگے اور ہم پر موجودات کا راز افشا ہو گا اور ہم بھی ظلمت سے نور کی طرف سفر شروع کرینگے اور ہمارے اعمال کا مرکب ہمارا انتظار کرتا ہو گا جو ہمیں اپنی اپنی منزل تک لے جائیگا۔ کوئی دائیں طرف والوں کے ساتھ کوئی بائیں طرف والوں کے ساتھ اور کوئی قریب والوں کے ساتھ ہو لیگا۔

ایک بار پھر میری نگاہ ان کی میت پر پڑی اور میں نے اپنے قلب و روح کی سرگوشی کو سن لیا۔ کہہ رہے تھے۔

یہ تو محض ان کی وہ غلاف ہے جس میں وہ لپٹے ہوئے تھے۔ اس غلاف کو لوگ ابھی قبر میں ڈال دینگے اور سمجھ لیں گے کہ یہی موت کا منطقی نتیجہ ہے۔ مگر میں محوِ افکار پریشان سوچتا رہا۔

کیا خوابِ لحد ہی موت ہے
کیا روز و شب کا یہ سلسلہ ہی زندگی ہے
کیا ہماری یہ مستی و نیم خوابی ہی زندگی ہے
اگر یہ سب زندگی اور موت کی تفسیر نہیں تو پھر آخر اس کی تفسیر کیا ہے

اور مجھے شاعرِ مشرق سے اس کا جواب ملا۔

سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو — نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلہ روز و شب کا — نہیں زندگی مستی و نیم خوابی
حیات است در آتشِ خود طپیدن — خوش آن دم کہ این نکتہ را بازیابی
اگر ز آتشِ دل شرارے بگیری — تواں کرد زیرِ فلک آفتابی

●

تحریر: شبنم قیوم

میرے قدر شناس

ایک ایسی قدر آور شخصیت جو خوش لباس زیب تن کر کے ہمیشہ سینہ تان کر چلا کرتے ہیں جن کے نورانی چہرے پر سفید داڑھی خوب بجتی اور سر پر قراقلی ٹوپی جن کی شان بلند کرتی ہے۔ انہیں ان کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے مجھے ہرگز گوارہ نہیں ہو رہا ہے۔

محترم محمد امین بچہ صاحب کی ہمہ گیر شخصیت نے مجھ پر ایسی چھاپ ڈالدی کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا جام ہر ذی حس کو ایک نہ ایک دن پینا ہے۔ جو بھی کوئی انسان اس دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اسکے ساتھ اس کی موت کا وقت بھی متعین ہوتا ہے اور سوائے باری تعالیٰ کے موت کے وقت اور ساعت سے کوئی بھی بشر واقف نہیں۔ ایسا ہوتا تو ہم اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں عجز و انکساری سے ضرور گزارش کرتے کہ ابھی بچہ صاحب کو اپنے ہاں نہ بلایئے کیونکہ ابھی انہیں بہت سے اہم کام انجام دینے ہیں۔ کم سے کم میرا ایک کام ان کے ذمہ تھا اور میری عدم موجودگی میں وہ یہ کام نہ کر سکے۔

مرحوم محمد امین بچھ کو میں زیادہ قریب سے جانتا نہ تھا۔ ہماری ملاقات السلام علیکم اور وعلیکم السلام تک محدود ہوتی۔ کبھی کبھار اُن سے علمی ادبی اور دینی محفلوں میں ملاقات ہوتی، اُن کے نزدیک میری ایک ادیب کی حیثیت کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ چونکہ وہ ادب شناس تھے۔ لہذا میری قدر کرتے البتہ زیادہ گُھل مل نہیں جاتے۔

اتفاق سے ادبی دنیا میں مجھے سیاسی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرنا پڑی۔ جون ۱۹۷۵ء میں میرا پہلا سیاسی موضوع پر ناول "یہ کس کا لہو ہے کون مرا" منظر عام پر آتے ہی جب ضبط ہوگیا اور وقت کے حکمرانوں کی طرف سے مجھے پابند سلاسل کیا جانے لگا۔ تو میری جرأت کی داد دینے والوں اور میری ڈھارس بندھانے والوں میں محمد امین بچھ صاحب بھی شامل ہوئے۔ پورے سات سال کے عرصے کے بعد جب میرا یہ ناول ۱۹۸۲ء میں دوبارہ منظر عام پر آیا تو اس ناول نے مجھے عزت و شہرت سے نوازا۔

کئی ساتھیوں نے مجھے سیاسی ناول لکھنے کے بعد اب تاریخی واقعات پر مبنی کتاب لکھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے یہ مشورہ قبول کرلیا۔ چنانچہ متواتر سات سال تک محنت و مشقت کے بعد میں تاریخ کشمیر کے پس منظر میں پانچ جلدوں پر مشتمل "کشمیر کا سیاسی انقلاب" نامی کتاب منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوا۔ اس کتاب کا ایسا چرچا ہوا، اور قبول عام کی اسے ایسی سند مل گئی۔ کہ مجھے تاریخ نویس کے زمرے میں شامل کیا گیا۔

"**کشمیر کا سیاسی انقلاب**" نے مجھے واقعی دوام بخشا۔ میری عزت اور شہرت میں بے حد اضافہ کر دیا۔ مجھے مختلف اطراف سے نہ صرف مبارکبادی کے پیغامات مل گئے بلکہ میرے پاس آکر مبارک باد دینے والوں کا تانتا سا بندھ گیا۔ چھوٹے بڑے اور بزرگوں کے ساتھ میرے ہاں آنے والے ایسے معمر بزرگ بھی تھے جن کو اپنے در کی سیڑھیاں چڑھانے کے لئے مجھے اُن کو سہارا دینا پڑا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی مرحوم محمد امین بچھ صاحب کی اور میں اپنی روداد بیان کرنے

لگا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میرے گھو پر مبارکباد دینے کے لئے تشریف لانے والوں میں ایک بچھ صاحب بھی تھے جنہوں نے مجھے ایسی تاریخی کتاب لکھنے پر نہ صرف گلے لگایا بلکہ میرا ہاتھ اور ماتھا بھی چوما۔ ان کی اس قدر قدر شناسی نے مجھے ان کا ایسا گرویدہ بنا دیا۔ جیسا میرا ان کے ساتھ خون کا رشتہ تھا۔ ان کے ایک بار گلے ملنے سے میں ان کے اتنے قریب آگیا کہ وہ میری موجودگی اور غیر موجودگی میں میرا ذکر چھیڑ کر میری اتنی تعریفیں کرتے کہ مجھے خود پر شک ہونے لگتا۔ امین صاحب جب بھی مجھ سے ملتے ہاتھ ملانے کے بعد گلے مل لیتے اور بتاتے "کشمیر کا سیاسی انقلاب" لکھکر تم نے اس قوم پر ایک بڑا احسان کیا' ان کا ایسا کہنے سے مجھے یقیناً وہ صلہ مل جاتا جو عام طور پر ایسے کام پر کسی کو ایوارڈ دیکر مل جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے جولائی ۱۹۹۲ء میں جب میں سفر محمود سے واپس لوٹ آیا۔ تو ایک روز میں گھر سے نکل کر بلواڑ روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ میری نظر محمد امین بچھ پر پڑی جو بوچھوارہ کی طرف پیدل آرہے تھے۔ گرمی کی شدت تھی اور وہ پسینہ سے شرابور تھے۔ چلتے چلتے جب ہم دونوں قریب پہنچے تو میں نے انہیں سلام کیا' انہوں نے سلام کا جواب دیکر فرمایا — "مجھے شبنم قیوم کے گھر کا راستہ بتایئے' میں پہلے یہاں آچکا ہوں' لیکن اس چوراہے پر یاد نہیں پڑتا کہاں سے چلنا ہے۔ یہ ہماری ملاقات ہوٹل STAR HILL کے پاس ہوئی۔ جہاں پورے چار راستے ملتے ہیں۔ بچھ صاحب کی زبانی ایسا سُنکر مجھے کسی قدر حیرانی سی ہوئی۔ البتہ انہیں بتایا — "کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

میرا ایسا کہنا تھا کہ وہ بے اختیار مجھ سے گلے ملے۔ میں نے انہیں گھر چلنے کو کہا' لیکن انہوں نے اس وقت اتنی سی ملاقات کو غنیمت جان کر پھر کبھی آنے اور سفر کی داستان سُننے کا وعدہ کیا'۔

بچھ صاحب نے لگے ہاتھوں مجھ سے شکایت کی کہ انہوں نے "کشمیر کا سیاسی انقلاب"

نامی تاریخی کتاب پر ایک سیر حاصل تبصرہ قلمبند کرکے ایڈیٹر "سرینگر ٹائمز" کو اشاعت کے لئے بھیجدیا تھا لیکن انہوں نے وہ اپنے اخبار میں نہیں چھاپا' میں اُن سے شکایت کرنے جاؤں گا۔

"کوئی فائدہ نہیں شکایت کرنے کا" میں نے جواب دیا۔ "کیونکہ وہ اسے چھاپے گا نہیں"

"کیوں نہیں چھاپے گا وہ تو آپ کا رشتہ دار ہے" انہوں نے شکوہ کیا۔ میں نے زیرلب مسکراکر جواب دیا۔ "اسی لیے نہیں چھاپے گا کیونکہ وہ میرا......

"اچھا سمجھ گیا ـــ ؟" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے انہیں ان کے اخبار "چنار" کی یاد دلادی' امین صاحب نے پیر غیاث الدین سے اخبار "چنار" کے حقوق حاصل کرکے اپنی زیر نگرانی اس کی اشاعت شروع کردی تھی۔ پھر اس کی اشاعت روکدی' میں نے بچہ صاحب سے عرض کیا ـــ "اگر آپ مجھے اخبار "چنار" کے حقوق دیں گے تو میں اسے چالو کروں گا۔"

میرا ایسا کہنا تھا کہ انہوں نے میرا بایاں بازو پکڑ کر مجھے چلنے کو کہا۔

میں نے پوچھا کہاں ـــ ؟

انہوں نے جواب دیا۔ "میں آپ کو ڈویژنل کمشنر کے دفتر لے چلتا ہوں' وہاں ابھی اسی وقت اپنے اخبار "چنار" کے حقوق آپ کے نام وقف کروں گا۔"

چونکہ میں اس وقت کسی دوسرے کام سے گھر سے چلا تھا لہٰذا انہیں بتایا۔ آج نہیں پھر کبھی....

افسوس! وہ پھر کبھی نہ آسکا' عدیم الفرصت ہونیکی وجہ سے میں "چنار" حاصل کرنے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا امین صاحب اس دنیا سے چلے جانے کے لیے بڑے اتاولے ہیں۔ تو میں پہلی فرصت میں ان کے ساتھ ہولیتا' آج جبکہ وہ ہم میں نہیں مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے وقت کی قدر نہ کی۔

محمد امین صاحب ہم سب کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔ البتہ سچ تو یہ ہے کہ ایسی شخصیتیں مرتی نہیں۔ جو لوگ اس دنیا میں اپنے نقش اور یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے نام اور کام سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ☆

انجینئر جی آر میر

آہ!

خواجہ محمد امین صاحب

آہ! خواجہ محمد امین صاحب کی موت نے گوناگوں صفات سے مزیّن ایک منفرد شخصیت کے مالک کو ہم سے جُدا کر دیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلیہِ راجعون! مجھے یقین ہے اُن کی بے باکی، حاضر جوابی اور متانت کے ساتھ طنز و مزاح نے اُنہیں نہ صرف ایک خوش طبع، پُر کشش انسان بننے میں مدد کی بلکہ علم دوست وادب نواز ہونے کے ناطے بارہا وہ پُر تکلف مجالس سے شمعِ محفل بن کر نکلے۔ قریب سے نہ جانتے ہوئے بھی میں زمانۂ طالب علمی سے ہی اُن سے مل کر ہمیشہ یک گونہ روحانی مسرت حاصل کرتا اور وہ بھی بحمداللہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے۔

اس پسِ منظر میں غالباً دو سال پہلے کی بات ہے میں اقبال اکاڈمی کے چند ممتاز دانشوروں کی معیت میں محترم عارف صاحب کی عیادت کے بعد واپس آرہا تھا۔ راستے میں ڈاکٹر ملک صاحب اور مرحوم امین صاحب بذلہ سنجی میں محو ہوگئے اور میں خاموش ہمہ تن، ہمہ گوش اُن کے کلامِ نرم و نازک سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ خوش قسمتی سے دفعتاً امین صاحب مرحوم جوش جلال میں آکر ایک دو باتیں کچھ ایسی کہہ گئے جو میرے لئے اچھنبے سے کم نہ تھیں۔ میں نے محتاط انداز میں



اقبال اکیڈمی کی ایک تقریب میں ــــ
پروفیسر منظور عالم، قیصر قلندر اور عبدالحق برق کے ساتھ۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

اشارہ دیا کہ مسلمانوں کے مابین اختلافی مسایل پر رائے زنی کرنے سے فتنہ و فساد کی وجہ سے مسلمانوں کو پہلے ہی بہت نقصان پہنچا ہے، بہتر یہی ہے موضوع سخن بدل دیا جائے۔ مگر مجھے اُس وقت لگا کہ مرحوم امین صاحب نے میرا نکتہ یکسر نظر انداز کر دیا، جس سے میری ذہنی اُلجھن میں اضافہ ہوا، کیونکہ مرحوم سے مجھے یہ توقع نہ تھی۔

گھر پہنچ کر خیال آیا کہ اتنے معقول و معروف عالم و دانشور سے وضاحت طلب کئے بغیر جانے میں کب تک بے کل و سرگرداں رہوں اور ہو سکتا ہے کہ ناحق جناب امین صاحب کے متعلق دل ہی دل میں بدگمانی کے علاوہ دانستہ یا نادانستہ اوروں میں بدظنی پیدا کرنے کا موجب بنوں۔ چند روز اسی گومگو میں گذار کر میں نے دل میں ٹھان لی کہ نتائج سے خائف ہوئے بغیر مجھے اُن سے ضرور التماس کرنا پڑے گی کہ وہ للہ آج سے اپنا تمام زورِ خطابت و زورِ قلم مسلمانوں کی زبوں حالی کو اُجاگر کرنے، اُسکے اسباب و نتائج اور علاج پر مرکوز کرنے کا بیڑا اُٹھائیں، کیونکہ فرقہ بندی اور مسلکی اختلاف پر ایک دوسرے کو موردِ الزام بنانے سے اُمتِ مُسلمہ، جسے بڑے شد و مد سے "وَاعتصمو بحبل اللّٰہ جمیعاً وَلاتفرقو" کا قرآنی درس ذہن نشین کرا دیا گیا تھا، چار دانگ عالم میں ہر طرف معتوب و مطعون، ضعیف و مظلوم بن کر طوفان و تلاطم سے دوچار ہے۔ صحیح اسلامی کردار ناپید ہے۔ بس بانت بانت کی بولیاں، رنگ برنگی ٹولیاں میدان کارزار میں بے بس ولاچار دشمنوں کے نرغے میں، بلکہ اکثر اُن کے طفیلی چیلے چانٹے بن کر ہر سُو مظالم کا شکار بننے پر بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہونے پر تیار نہیں ہوتے۔

اِتفاقاً دُو بدو ملاقات میں تاخیر کے باعث میں نے آخر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی طرف سے بڑے خلوص و احترام کے ساتھ یہ جذبات ڈاک کے ذریعے مرحوم امین صاحب کو ارسال کئے۔ معاً تشویش بڑھی کہ ایسے کُہنہ مشق عالِم و قلمکار سے زبان مِلانا غلط فہمیاں پیدا کر کے شاید کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن جائے۔ کیونکہ مرحوم امین صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بڑے بڑے طاغوتی شاہسواروں کے سامنے ہار ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے پھر میری

بساط کیا؟ یقیناً یہ احمقانہ حرکت شاید دیکھتے دیکھتے ہی اُن کی معلومات، فصاحت و بلاغت کے سامنے ایک ہی جواب میں مانند پڑ کر خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے۔ کیونکہ میں نے اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں اختلافات بین المسلین کی وضاحت کرتے ہوئے بادل ناخواستہ چند ایسے مُسلط شدہ منافق حکمرانوں اور خرقہ پوش عُلماءِ سوء کی نشاندہی کی بھی جرأتِ رندانہ کی۔ یوں بحث کا دائرہ وسیع تر ہوگیا کہ کیا مسلمانوں کے اختلافات تواریخی وجوہات سے بھی منسلک ہیں یا محض ہم لوگوں کی بے سمجھی ہے؟۔ کیا ایک ہی گھر کے افراد میں خونی رشتہ ہونے کے باوجود روزمرّہ مسایل پر اختلاف پیدا نہیں ہوتا؛ تو کیا وجہ ہے کہ ہم اِن اختلافات کو باعثِ فتنہ وفساد بنائیں۔ اختلاف ہونا امتدادِ زمانہ کا خاصا ہے، ہاں مگر جاہل واستعماری عناصر مل جل کر ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کیا کلمۂ توحید، قرآن و کعبہ سب مسلمانوں کا مشترکہ وِرثہ نہیں پھر فروعی اختلافات پر جھگڑوں سے ملت کو روز بروز کمزور بنانا کیا معنی رکھتا ہے اس سے تو دشمنوں کو ہی فایدہ پہنچتا ہے۔

دونوں طرف سے جواب اور جواب الجواب کا دور چلا۔ پھر ایک دفعہ جناب امین صاحب نے اپنی عظمت کا سکّہ میرے دل پر یوں بٹھایا کہ بالآخر یک طرفہ طور مذکورہ متفقہ دلایل کی نظر میں مزید خط وکتابت بند کردی۔ میں کس زبان سے اُن کو خراج عقیدت ادا کروں؟ وہ ایک مخلص مسلمان تھے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان

اسکے بعد ایک دو بار پھر مختصر ملاقات ہوئی اور وہ دل کھول کر بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اللہ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے! آپ یقین مانئے اُن کے سانحہ ارتحال کی خبر اخبار میں پڑھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ اور ساتھ ہی یہ شعر وردِ زبان ہوگیا۔

سود و زیاں کا ذکر کیا جب ہو جنوں کا کاروبار آج ہیں سب کو الجھنیں میرا حساب صاف ہے

غلام محمد واعظ

خوش طبیعت خوش بیاں

پیرانہ سالی میں جوان

مرحوم خواجہ محمد امین پچھ کی وفات حسرت آیات سے ہم ایک مخلص اور غم گسار رفیق سے محروم ہو گئے ہیں، ان کی جُدائی کے باعث ایک شدید احساس محرومیت اور احساس زیاں ہم پر غالب ہے۔ جس سے طبیعت افسردہ اور آزردہ ہوتی جارہی ہے۔ ایک اہل قلم اور ممتاز صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ مرحوم ایک خوش باش، خوش خو، خوش رو، خوش اندام اور فقید المثال شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی وفات سے نہ صرف آسمان صحافت کا ایک اور چراغ بجھ گیا بلکہ مجلسیں اور محفلیں جن میں انکی آمد اور شمولیت روح افزا اور رونق افروز ثابت ہوتی تھی اُن کے راہی عدم ہونے سے ایک انمول سرمایہ سے محروم ہو گئی ہیں، مرحوم کی مجلس آرائی اور خصوصاً ادبی، صحافتی اور ثقافتی مجالس میں ان کا کردار ایک نمایاں امتیاز کا متحمل تھا۔ انکی ہمہ گیر شخصیت اور ظرافت طبع سے جہاں بھی وہ تشریف فرما ہوتے زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑتی نظر آتی۔ ان کے حُسن کلام، اسلوب بیان اور ظرافت آمیز دلائل سے مجلسوں کی رونق دوبالا ہوتی تھی۔

وہ ناامیدی، نامرادی، بے دلی، بے عملی اور بُزدلی جیسے منفی رجحانات کے خلاف عمل پیہم، استقلال و استقامت، بے باکی، مہم جوئی اور زندہ دلی کا ایک غیر متزلزل پیغام تھے۔ بے دل کے شعر ؂

زندگی در گردنم افتاد شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

دہراتے ہوئے شاد باید زیستن کے نظریہ کے ترجمان بنکر قنوطیت اور نا اُمیدی کی یکسر تردید کرتے ہوئے زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے۔

ان کی دوست نوازی، وسیع القلبی، اور ظرافت طبع ان کی شاندار زندگی کو اور بھی پُرکشش، قابل تقلید، اور قابل ستائش بناتی رہی۔ دوستی کا ہاتھ جہاں بڑھایا وہاں دوستی کے مراسم اور لوازمات کی تکمیل میں ذرہ بھر فرق نہ آنے دیا۔ بلکہ دوستوں کے دُکھ سُکھ میں جس انہماک، لگن، اپنائیت اور مثالی جذبے کے ساتھ وہ شرکت کرتے وہ یقیناً ان کی شان اور خلوص کا ایک نمایاں پہلو تھا۔

کوئی دو سال قبل مرحوم پروفیسر حاجنی کی مزاج پُرسی کے لئے اقبال اکیڈیمی کا ایک وفد حاجن پروفیسر موصوف کی رہائش گاہ پر ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلا گیا۔ مرحوم بچھ صاحب اکیڈیمی کے ایک بنیادی اور خصوصی ممبر کی حیثیت میں شامل وفد تھے۔ پروفیسر صاحب سے ملنے پر اُن کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ مرحوم بچھ صاحب نے تجویز پیش کی کہ پروفیسر حاجنی صاحب کے مزید علاج و معالجہ کے سلسلے میں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کا اہتمام کیا جائے۔ پروفیسر صاحب نے اشارتاً اسباب کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ مرحوم بچھ صاحب کافی دیر پروفیسر موصوف کی حالت زار کے زیر اثر اظہار تاسف کرتے رہے اور پروفیسر صاحب کو "باتوں کا بیوپاری" جتلا کر ان کے علم و فضل، بے باکی اور سادگی کی رقت آمیز لہجے میں داد دیتے رہے۔

ان کی شرافت طبع، اوصاف حمیدہ، دین و دُنیا کے معاملات کا ادراک، مسائل کا

سلجھاؤ، اور محبت، شفقت اور اخوت کی فراوانی نے انہیں ایک منفرد مقام عطا کیا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بصد اشتیاق احقر کے دفتر پر آنے کی زحمت گوارہ کرتے اور وہاں رفقاء کو اپنے حُسن کلام اور دینی، سماجی اور سیاسی مسائل پر تفصیلی تبصروں سے مستفید فرماتے۔ ان کا کلام ان کے علم وادب، وسعت مطالعہ اور زندہ دلی کی ایک جاذب نظر تصویر پیش کرتا تھا۔ اور ہر ایک حتیٰ کہ مسلکی اور نظریاتی اختلاف رکھنے والے حضرات بھی ان کے زور قلم، استدلال اور عقل ودانش کی داد دئے بغیر نہ رہتے۔

ایفائے عہد اور وقت کی شدت کے ساتھ پابندی ان کے امتیازی خصوصیات میں داخل تھا۔

ملاقات میں کچھ ناغہ واقع ہو جاتا تو بغلگیر ہوئے بغیر ان سے نہیں رہا جاتا۔ کبھی کبھی ملاقات نہ ہونے کی صورت میں میز پر ایک پرچی چھوڑ جاتے اور اپنے شفقت کے جذبات اور میری عدم موجودگی اور ملاقات کی نایابی پر احساس زیاں کا اظہار کرتے۔ ایسے غمخوار علم وفضل اور شرافت وظرافت سے بھرپور بزرگ رفیق کا بچھڑ جانا ایک سانحہ عظیم سے کم نہیں۔ ان کا انتقال پُرملال میرے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ میں ذاتی طور ایک شدید احساس کرب سے دوچار ہوں کہ میں ایک ممتاز، لائق وفائق، قابل دید اور قابل داد محسن اور بزرگ رفیق سے محروم ہو چکا ہوں۔ میں زندگی بھر ان کی بصیرت افروز ملاقاتوں، ان کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی ممتاز اداؤں اور ان کی دوست نوازی کی یاد سے اپنے دل کو معمور پاتا رہوں گا۔

مرحوم ایک ذات نہیں بلکہ ایک انجمن INSTITUTION تھے۔

مرحوم بچھ صاحب کے تئیں خراج تحسین کا فریضہ کیسے ادا ہو! جس شفقت، مودت

اور پیار سے مرحوم احقر سے پیش آتے رہے اور احقر کے معاملات میں جو غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے اسکے پیش نظر خراج عقیدت کے یہ چند الفاظ سپرد قلم کر کے یہی کہنا چاہوں گا کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

میں شاعر مشرقؒ کے ان اشعار کے ساتھ آپ سے اجازت چاہوں گا۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

قاضی محمد طارق

امین صاحب

— قدروں کا امین

امین صاحب مرحوم سے قرابت داری کے علاوہ بھی مجھے کئی رشتوں کا شرف حاصل رہا۔ مجھے فخر ہے کہ انہوں نے مجھے بھی اپنے بیٹوں کا درجہ دے کر مجھے "دوست" جیسی بہترین اصطلاح سے نوازا۔ اُن کا مُبارک چہرہ اکثر نگاہوں کے سامنے آتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں ؎

چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان کچھ بھی دو
جس رُخ سے بھی پڑھوگے مجھے جان جاؤ گے

موصوف کی شخصیت ایک مشعل راہ ہے اور محتاج بیان نہیں۔ تعریف میں ایک دفتر درکار ہوگا۔ اختصار یوں ہے کہ مرحوم نہ صرف دیندار اور صالح مسلمان تھے بلکہ اپنے فن میں یکتا اور

صاحبِ کمال تھے۔ کسی شاعر کی زبان میں مرحوم شاید ہمیں یہ ہمیشہ یاد دِلاتے رہیں گے کہ ؎

ترتیب دے رہا ہوں وہ اوراقِ زندگی
دُنیا کے واسطے جو مثالی کتاب ہو

ایسی شخصیات بہت نادر ہوتی ہیں اور اُن سے استفادہ کرنے والے خوش نصیب' خاکسار نے مرحوم کو صرف اپنے دوست اور مخلص بھائی جیسے ہم زُلف (مصباح النور صاحب) کے والد کی حیثیت سے ہی نہیں پہچانا بلکہ مجھے ہمیشہ اُن میں ایک مشفق و مہربان بزرگ، پُرخلوص رہبر اور وسیع القلب دوست نظر آیا۔ نقصان ناقابلِ تلافی ہے' الفاظ کا سہارا مرحوم کی صفات بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اُن کے مُتقی، پرہیز گار اور بُردبار ہونے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ سادہ خصلت اور نیک فطرت بھی تھے۔ شخصیت ایسی جامع تھی کہ کئی بار یہ تعجب ہوتا کہ کیا یہ ایک ہی شخص ہے کہ بیک وقت مربّی بھی ہے اور ملنسار بھی' خوش باش' خوش کلام بھی ہے اور خوش خیال بھی' پُرمذاق' جانِ محفل بھی ہے اور پُروقار بھی۔ غرض مرحوم اپنے وقت کے منفرد اور لاکھوں میں ایک تھے۔ بارہا مرحوم سے رخصت ہوتے وقت میں دِل میں یہ تاثر لے کر لوٹتا تھا کہ آپ واقعی انسانی قدروں کے ایک شاہکار ہیں۔ آج بھی موصوف ہماری صفوں میں موجود ہیں' آئندہ بھی رہیں گے' ایسی ہستیاں بھلائے نہیں بھولتی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے' اُنہیں غریقِ رحمت کرے اور اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ (آمین)

غلام نبی ہاگرو

مُحمّد امین بچھ

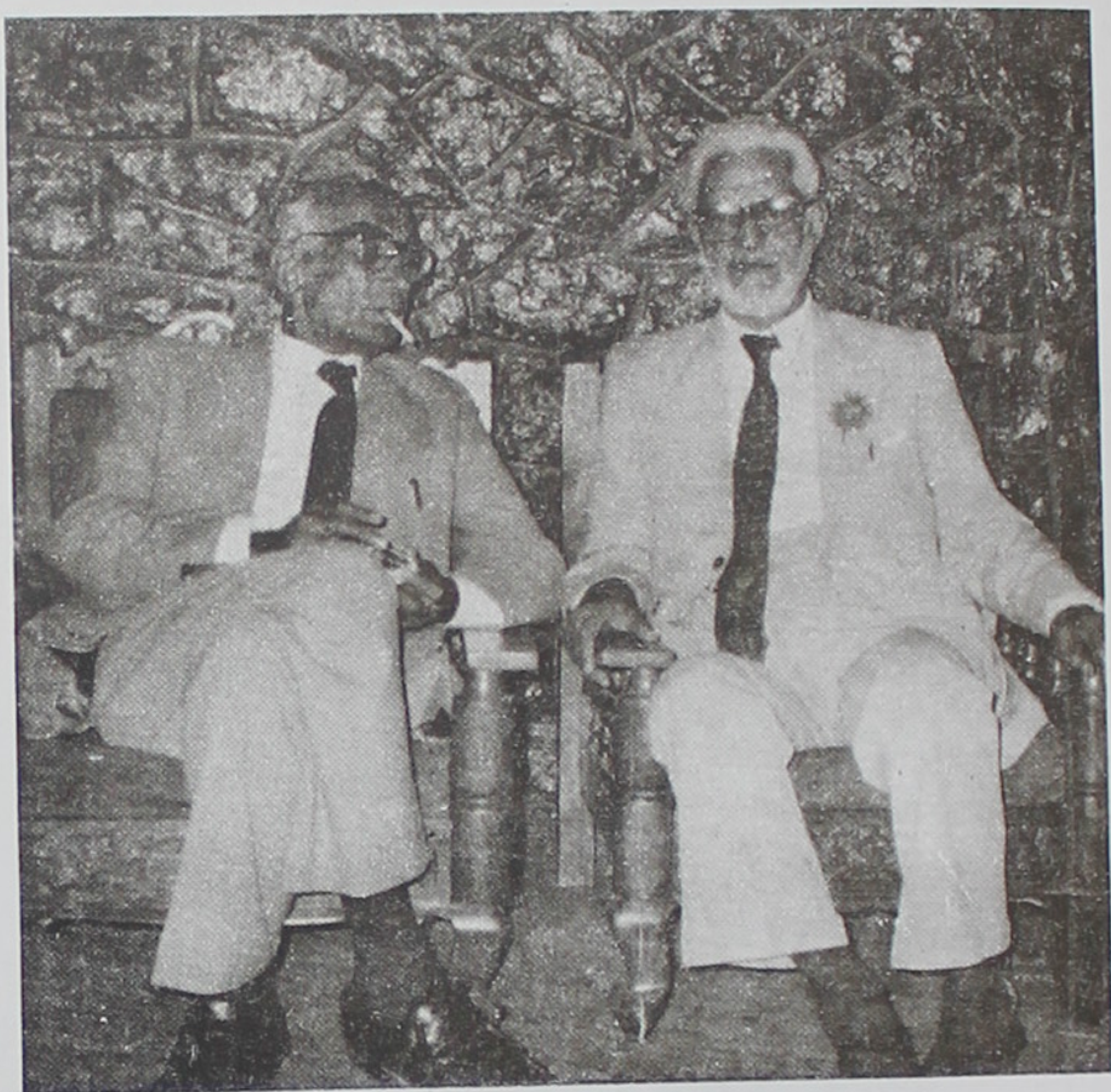
ـــــ ایک مخلص انسان

محمّد امین بچھ اپنی عمر تمام کرکے ۸ اور ۹ جون ۱۹۹۲ء (مطابق ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ) کو صدر ہسپتال سرینگر میں فوت ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ راجعُون۔ اپنی جان جان آفرین کو سپرد کرنے سے قبل وہ ایک دن بھی بیمار نہ رہے۔ ہاں کوئی سوا نو بجے رات مرض الموت طاری ہوا اور کوئی ساڑھے بارہ بجے رات اُن کی روح پرواز کر گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دست بہ دعا ہوں کہ وہ اُن کے سہو و خطا معاف فرمائے۔

کچھ عرصہ سے محمد امین بچھ کے جسمانی قویٰ قدرے ناتواں ہوئے تو تھے۔ لیکن ان کی فکر و نظر اور فہم و فراست پختہ سے پختہ تر ہوتی جا رہی تھی۔ محمد امین بچھ بڑا خوش قسمت تھا کہ وہ ادب نواز تھا۔ ادیب نہیں تھا۔ وہ شعر فہم تھا شاعر نہیں تھا۔ اس لئے وہ غالب کے اس طنز سے بچ گیا تھا۔ جو طنز شاعر غالب نے دہلی کے مقروض غالبؔ پہ کی تھی۔ ؎

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے کہ نوکر نہیں ہوں میں

ورنہ وہ بھی نزاکت خیال کی داد وصول کرنے کے بہانے اپنے بچوں کو ٹیکنیکل کالجوں کی دہلیز سے گذار کر اونچے مراتب تک پہنچاتے۔ ورنہ وہ بھی حکمرانوں کے سیاسی مخالفین پر بجلی گرانے کا کام کرتے۔ اور اس کا معاوضہ منہ مانگے داموں وصول کرتے۔ ورنہ وہ بھی ان ٹیڑھی راہوں پر چلتے جن پر چلنے والوں کو خلعتیں بخشی جاتی تھیں اور وہ اس طرح اطمینان ویقین کی دولت بے بہا کے ساتھ راہئ ملکِ عدم نہ ہو جاتے۔ جس طرح ورنہ وہ بھی صدف کو گوہر نایاب کے ہوئے نایاب قرار دے کر اعزاز واکرام پا کر طاؤس کی طرح پرواز کرنے لگتے اور اونچائیوں کو چھوتے ہی کمزور سہاروں کی وجہ گر پڑتے۔ ورنہ اُن کو بھی جھوٹے عرفان کا سوانگ رچانا پڑتا اور وہ بھی دم آخریں تعلق باللہ کو مضبوط کرنے کی فکر کرنے کے بجائے اپنے ہی کلام کے بعض حصول کو ۵۵۵ ۵۵ کرنے کی رٹ لگا کر قبر کا منہ دیکھ لیتے۔ ورنہ اُن کو بھی ماسکو اور تاشقند کے سرکاری ادیبوں شاعروں اور افسانہ نویسوں سے یارانہ تو ہوتا لیکن کشمیر کے مظلوم اور لپسے ہوئے لوگ اُن کو اپنا نہ سمجھتے۔ اُن کے درمیان اور مظلومانِ کشمیر کے درمیان اپنائیت کا جو رشتہ ان کو تادم آخر رہا۔ وہ پروفیسر محی الدین حاجنی کے بغیر کسی ادیب' ادب نواز' کسی شاعر' شعر فہم اور سخن فہم کو گذشتہ نصف صدی میں نصیب نہ ہوا۔ ایسے وقت پر مظلومان کشمیر کی ترجمانی کرنے کے سلسلے میں وہ شعر کہے بغیر ہی وہ شورش کشمیری بنے حالانکہ اُن کو نہ کامل ہونے کا دعویٰ تھا اور نہ فاضل ہونے کا اُن کو بچپنے میں اسلام اور مسلمانوں سے لگاؤ اور محبت ورثے میں ملا تھا اور یہی محبت اُن کی حرارت نفس تھی اور شرارِ غیرت بھی۔ اس سلسلہ وہ کبھی نادم نہ ہوئے۔ اس رشتہ و پیوند کو جاندار رکھنے کے لئے اُن کو جن لذائذ سے ہاتھ دھونا پڑا اُن کے اس طرح چھن جانے سے اُن کی کوئی رات شبِ فراق نہ بنی۔ غم دوراں اُن کی ذات کا احاطہ اس قدر کر چکا تھا۔ کہ ان کے غم ان کا حدودِ اربعہ کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ غم دوراں کے معنیٰ اُن کے نزدیک مظلومان کشمیر کی مظلومیت تھی۔ مسلمانان عالم کی محرومیاں تھیں اور جب گذشتہ نصف صدی میں حالات بھیانک صورت اختیار کرتے تو محمد امین بچھ



اقبالیات کے سربرآوردہ اسکالر، مشہور اردو شاعر اور نقاد پروفیسر آزاد کے ساتھ۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



امین صاحب۔ اردو زبان کی دو ممتاز شخصیتوں، سردار جعفری اور پروفیسر آزاد کے ساتھ۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

جگر مراد آبادی کا یہ شعر گنگناتے اور لذت لیکر سناتے ہے

طول شبِ فراق سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جسکی سحر نہ ہو

فارسی شعرار کا کلام اُن کو ازبر یاد تھا اور فارسی زبان کے چوٹی کے شعراء کے اشعار کو جموں وکشمیر کے حالات پر ایسے منطبق کرتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ گویا یہ شعر اسی صورت حال کے لئے لکھا گیا ہو۔ وہ گنتی کے اُن چند انسانوں میں سے تھے جو مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا صدق جدید عمر بھر پڑھتے رہتے تھے۔

اگست ۱۹۶۰ء میں مجھے محمد امین بچھ کا تعارف ہوا۔ میں نے اپنے مقالے میں جامع و مانع کی اصطلاح استعمال کی۔ اس اصطلاح کے استعمال پر اُن کو اعتراض ہوا۔ میں نے اُن کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ تو انہوں نے ایکایک ٹیلی فون گھما کر ریڈیو کشمیر سے رابطہ قائم کیا اور میر غلام رسول نازکی سے اس بارے میں فتویٰ چاہا۔ فتویٰ میرے خلاف جاری ہوا اور اس فتوے پر عبدالحق برقؔ نے مہر تصدیق ثبت کی۔ بات کو مختصر کرنے کے لئے "مانع" کا لفظ کاٹ لیا۔ چند دنوں کے بعد میں نے اُن سے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب تذکرہ مستعار لی اور اِسے پڑھا۔ مولانا آزاد نے جہاں جہاں بھی اس کتاب میں جامع ومانع کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ وہاں وہاں میں نے سرخ پنسل سے نمایاں نشان لگائے اور اسے پڑھنے کے بعد واپس کی۔ لیکن جس دن میں نے کتاب اُن کے ہاں پہنچائی وہ وہاں نہ تھے۔ اس کے کئی دن بعد ملاقات ہوئی۔ تو فرمایا "آپ میرے ہی کیا ہم سبھی کے استاد نکلے۔ جامع و مانع کی اصطلاح تو واقعی میں نے بھی کئی سال قبل پڑھی تو تھی لیکن ذہن سے اتر گئی تھی"۔ اس ملاقات کے کئی دن بعد انہوں نے اس بات کا برملا اعلان بھی کیا۔ یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔

مسلمانان ہند کی طرف سے انگریزی زبان میں کوئی ہفتہ وار یا پندرہ روزہ یا ماہنامہ نہ چھپتا تھا۔ روزنامہ تو ایک بھی تو نہیں چھپتا ہے۔ بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز نے ہفتہ وار

ریڈیئنس شائع کرنے کے لئے سکیم بنائی اور اس کے لئے مالیات حاصل کرنے کے لئے کوپن اجراء کئے۔ میں یہ کوپن لیکر محمد امین بچھ کے پاس گیا۔ تو اس سکیم کا تعارف کرایا تو لیکایک کہنے لگے۔ AFTER DAWAN THERE MUST BE RADIANCE

اس ذو معنی جملے میں محمد امین بچھ کی عمر کا فلسفہ سمٹ کر آگیا ہے۔ مسلم لیگ نے ۱۹۴۷ء سے قبل اپنا اخبار ڈان کے نام سے شائع کیا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد یہ اخبار پاکستان میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ ڈان انگریزی زبان میں پو پھٹنے کو کہتے ہیں اور ریڈیئنس انگریزی زبان میں چمک دمک اور ضو فشانی کو کہتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے (اخبار) ڈان کے بعد (دوسرے اخبار) ریڈیئنس کا ہونا ضروری ہے (تاکہ سلسلہ قائم ہو جائے)

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو تاریخ کشمیر نے جو پلٹا کھایا۔ وہ ان کے مزاج کو نہ بھایا۔ انہوں نے اپنے ہم مذاق شاعروں کی ادیبوں اور سخن وروں کی اپنائی ہوئی پگ ڈنڈیوں سے ہٹ کر خار دار راہوں پر اکیلے چلتے رہنے کا فیصلہ اول عمر میں کیا اور آخری سانس تک اس پر فیصلہ قائم رہے۔

محمد امین بچھ نکتہ پیدا کرنے اور بات سے بات نکالنے میں اپنے حلقۂ یاراں کے اندر یکتا تھے۔ وہ آبائی روایات کے مطابق زیارتِ حضرت خواجہ نقشبند صاحب ملارٹہ سرینگر ختم خواجگاں میں شمولیت کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی غلام نقشبند کے نام سے ہی ان کے خاندان کی نسبت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ غلام نقشبند صاحب چیف کنزرویٹر آف فارسٹس کے عہدہ فائز تھے۔ دونوں بھائی ایک بار ختم خواجگاں میں شریک تھے اور اُن سے تھوڑے سے فاصلے پر غلام نقشبند بھی بیٹھا تھا۔ مجاورِ مکرم شرکایان کے درمیان بانٹنے لگا تو غلام نقشبند کو مطابق عہدۂ جلیلہ زیادہ ہی دیا اور اس کے بعد یہی شرینی بانٹنے والا محمد امین بچھ کے پاس آیا۔ اور تھوڑی سی شرینی دیدی۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ محمد امین بچھ نے اُن ہی کے جودِ کرم کو اُس وقت بھی دیکھا تھا۔ جب

غلام نقشبند کی باری تھی۔ محمد امین بچھ نے ایک روپیہ جیب سے نکال کر دیا۔ اب مجاور مکرم حیرت زدگی ظاہر کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ سیخ پا ہو گیا تھا۔ اور محمد امین بچھ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ محمد امین بچھ تو اسی انتظار میں تھے۔ انہوں نے غلام نقشبند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان کا بڑا بھائی اور آپ نے شرینی کی تقسیم میں اُن کو بڑا مان لیا۔ اس لئے بڑی رقم بھی انہی سے چاہیئے۔" مجاور مکرم نے ندامت و شرمندگی کا اظہار بھری مجلس میں کیا۔

راجیو گاندھی بطور حزب مخالف کے لیڈر کے پارلیمانی وفد کے ساتھ ابتدائی نومبر ۱۹۹۰ء میں سری نگر آئے۔ یہ وفد سرینگر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے آیا تھا۔ ان دنوں سرینگر میں فضا کیا پورے کشمیر کی فضائوں سے گونج رہی تھی۔ اس لئے اس وفد کے ممبر کا سرکاری رہائش گاہ سے باہر قدم رکھنا محال تھا۔ کئی اعلیٰ سرکاری افسر صاحبان خواہش کرتے تھے کہ کئی لوگ اس وفد کے ارکان کے سامنے بھی تلخ و شرین باتیں کریں۔ اس لئے انہوں نے کئی لوگوں کو اوپر پیچ کیا اور ان سبھی کو ہوٹل پہنچایا جہاں اس وفد کے ارکان کو ٹھہرایا گیا تھا۔ اس وفد کے اس طرح وہاں جانے کے بارے میں عوام کے درمیان اختلاف رائے بھی ہوا ہے۔ اس پہلو پر بات کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس لئے اس پر بحث کئے بغیر ہی اصل موضوع پر آتا ہوں۔ محمد امین بچھ نے راجیو گاندھی کو منہ پر بتایا کہ آپ کے نانا نے جموں و کشمیر کے عوام سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُن کو جموں و کشمیر کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع دینگے۔ یہ بات آپ کے نانا نے لال چوک سرینگر میں عوام کے بڑے مجمع کے سامنے کہی ہے اور بعد میں اس وعدے سے مکر گئے۔ اُن کے مکر جانے سے تو جموں و کشمیر کے عوام کی زبان بند نہیں ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ وعدہ سے مُکر جانے والے کے خلاف نفرت و عداوت اور غیض و غضب پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ آپ اپنے نانا پنڈت جواہر لال نہرو سپوت اُسی

وقت ہونگے جب جموں وکشمیر کے عوام کو وہ حق دیں گے ان کو پنڈت جی کے خلاف
نفرت وعداوت نہ رہے۔ غیض و غضب کا عالم تو آپ سرینگر میں دیکھ سکتے ہیں۔
کان لگا کر تو نعرے بھی سُنیئے"۔

(ان دنوں سرینگر میں ہر بستی اور ہر محلے کے لوگ نعرے لگا رہے
تھے۔) ☆

ڈاکٹر مرغوب بانہالی

"خزینہ امین" کا جزوی تعارف

اقبال اکیڈمی کے ایک بزرگ رکن خواجہ محمد امین بڑھ کو رحمتِ حق ہوئے ابھی دوسرا مہینہ بھی نہ گذرا تھا کہ مجھے اُنکے سوگوار خاندان کے ساتھ ایک دو گھنٹے مل بیٹھنے اور مرحوم کی یادگار چھوڑی ہوئی گرانقدر تحریرات کو ایک نظر دیکھنے کا موقعہ میسر ہوگیا۔ ایک دل خوش کن ضیافتِ طبع اس ڈھنگ سے بہم پہنچانے کے لئے میں اپنے دو قدر دانوں اور یونیورسٹی کے دو قابل اُستادوں یعنی پروفیسر غلام رسول ملک صاحب اور ڈاکٹر بشیر احمد نحوی صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے اقبال اکیڈمی کے لائق و فائق صدر اور سیکرٹری کی حیثیت سے ایسی نشست کا پروگرام ترتیب دیکر مجھے ایک مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اور اکیڈمی کے ایک رُکن کی حیثیت سے شرفِ ہمراہی بخشا۔ ہم نے وہاں ایک اور سرگرم رکن جی، ایم واعظ صاحب سمیت مرحوم بڑھ صاحب کی پچپن سالہ تحریرات کو نو ایسی جلدوں پر مشتمل پایا جن کو جدید اصطلاح میں نو ڈائریاں کہہ کر بھی یاد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ اُن میں درج تحریرات گذشتہ نصف صدی کے کشمیر کی ثقافتی اور سیاسی زندگی کا بلیغ تعارف کرانے کے علاوہ خود تحریر

کرنے والے کے اعلیٰ مطالعے کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں اسلئے ہم نے باتفاق رائے ان یادداشتوں کے مجموعے کو "خزینۂ امین" نام رکھا۔ اِس نام کی مزید وضاحت کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک شائستہ، شریف النفس، خوش پوش اور خوش وضع شہری کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ علم وادب کی سنجیدہ محفلوں کے ایک شیفتہ وشیدا کی حیثیت سے بھی مرحوم محمد امین بڑھ گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران سرینگر کے اکثر علمی حلقوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ فارسی زبان وادب کی مہارت کے علاوہ آپ کو انگریزی اور اردو پر بھی یکساں دسترس حاصل تھی۔ مشہور بڑھ خاندان[1] کے اس چشم و چراغ نے دیگر خواجہ زادگاں کی طرح اپنی عمرِ عزیز کو دولت و ثروت کی ریل پیل کے ہاں رہن رکھنا گوارا نہ کیا۔ اُس ریل پیل میں اکثر گُم ہو جانے والوں کے برعکس آپ نے ایک دردمند مسلمان اور ایک خودشناس کشمیری کی حیثیت سے اپنے عرصۂ حیات کے بڑے حصے کو لِسباط بھر ملی اور علمی خدمت انجام دینے کے لئے وقف رکھا۔ یہ راسخ العقیدہ صحافی اور قلمکار خداشناسی، مِلت شناسی اور خودشناسی

---

[1] کشمیر کے مختلف خاندانوں کی نسبی فضیلت اور مختلف ذاتوں کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے بعض تذکرہ نویسوں نے جو غلط سلط باتیں درج کر رکھی ہیں وہ صرف اسی ایک لحاظ سے گمراہ کن نہیں کہ اُن کے پڑھنے سے اِنَّ اَکرَمَکُمْ عِندَ اللہِ اَتقٰکُمْ جیسے ناطق معیارِ فضیلت کو پسِ پشت ڈالنے کا رجحان عام ہو جاتا ہے بلکہ یہی باتیں برہمنی سوچ اور ذات پرستی کے منفی رُجحان کو بھی مسلمانوں میں تقویت بہم پہنچاتی رہی ہیں۔ اگر ہم ایسی باتوں کی محرک بنی ہوئی جانبداری، مراعات جوئی اور شجرہ سازی جیسی نفسیاتی کمزوریوں کی چشم پوشی کرنے کو جائز بھی سمجھیں پھر بھی اُن باتوں کے بعض بحث طلب، محلِ نظر اور مضحکہ خیز پہلوؤں کی پذیرائی کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے پہلے ہی "پدرم سُلطان بود" کہہ کر خستہ و خراب ہوگئی ہوئی اُمت میں وہ غلط مفروضے اور قِصے یونہی چلتے رہیں گے جو اپنی ذاتی ضرورتوں کے تحت بعض تذکرہ نویسوں نے وقتاً فوقتاً بغیر تواریخی شواہد اختراع کئے ہیں۔ (باقی اگلے صفحے پر)

کی راہ آیندہ نسلوں کے لیئے روشن تر بنانے کی غرض سے ہمہ وقت معروفِ مطالعہ رہا ہے اور اربابِ نظر کا فیضان عام کرنے کی غرض سے وہ مولانا رومی اور علامہ اقبال جیسے ملّی شعور کے معماروں کی تعمیری فکر و نظر کے موتی اپنی جنبیل خوشہ چینی میں برابر جمع کرتا گیا ہے۔ مرحوم بڑھ صاحب اپنے اس دفترِ درد و سوز کو ۸۰ سالہ زندگی کے آخری برسوں تک اسلاف کا نورِ بصیرت عام کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی غرض سے تحریر کرتے رہے اور یوں مورخ محمد الدین فوق جیسے دردمند کشمیریوں کی فہرست میں شامل ہوتے گئے۔ بڑھ صاحب کا ذکرِ خیر آگے بڑھانے سے پہلے ایک ممکنہ غلط فہمی کا پیشگی ازالہ کرنا چاہوں گا۔ میں نے اس مضمون کے حاشیے میں فوق صاحب کی صرف ذات شماری کو تلخ تنقید کا ہدف بنایا ہے ورنہ میں ان کی لگن اور شوق مطالعہ کا ہمیشہ دل سے قدردان رہا ہوں۔ اگرچہ محض ملّی زاویۂ نگاہ سے تنقید کرتے وقت بھی مجھے میرزا غالب کا یہ مشورہ برابر یاد آتا رہا کہ ؎ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ لیکن کسی فردیا خاندان کی نسبی مدح گستری سے بچتے رہنے کی غرض سے ذاتی طور پر مجھے نظامی گنجوی کا یہ رویہ

یا بعض پیشرو تاریخوں میں درج عبارات کو توڑ مروڑ کر وضع کیے ہیں، اس بحث کو طوالت سے بچانے کے لیے، ہم زیرِ نظر بڑھ (بچھ) خاندان کی بنیاد اور وجہ تسمیہ سے متعلق بیان کی گئیں چند باتوں کا مختصر اشاراتی تجزیہ کرنے پر ہی اکتفا کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہندوانہ سوچ سے غیر شعوری طور مغلوب ہو کر ذات نامے مرتب کرنے والے محمد الدین فوق صاحب کی اسم بے مسمیٰ "تاریخ اقوامِ کشمیر" کے صفحہ ۱۳۶ پر درج ایک اقتباس کی نوعیت اپنے سیاق و سباق کی روشنی میں کیا ہے۔ یہ اقتباس "بچھ" ذات کا عنوان دے کر اپنے ایک پیشرو کے حوالے سے یوں ترتیب دیا گیا ہے۔" خواجہ حسن شعری لکھتے ہیں کہ اس (بچھ / بڑھ) خاندان کا شجرۂ نسب سلسلہ وار جہانستان چنگیز خان تک پہنچتا ہے۔ گلزارِ خلیل میں لکھا ہے کہ بچھ خاندان کا ایک نادر (نامور) شخص "میر محمد علی" بادشاہ کے زمانہ میں واردِ کشمیر ہوا۔ میر محمد علی علم و فضل میں صاحب کمال تھے۔ بادشاہ نے انکی جاگیر مقرر کر دی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہی بہتر مشورہ دکھائی دیتا ہے کہ ؎

صاحبدلان خوشامدِ شاہان نہ کردہ اند　　آئینہ عیب پوشِ سکندر نمے شود

بہرحال اس ضمنی بات سے قطع نظر آپ یہ سن کر خوش ہونگے کہ اقبال اکیڈمی نے "خزینۂ امین" کی جلد ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں چند عمدہ فیصلے کئے ہیں جن کو مناسب وقت پر مشتہر کیا جائیگا۔ یہ بات بتادی گئی کہ خزینۂ امین میں شامل نو جلدوں کے مختلف وقتوں میں لکھے جانے کا مجموعی عرصہ پچپن سال پر محیط ہے گویا اس یادداشتی سلسلے میں خواجہ محمد امین بٹھ مرحوم کی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۹۲ء تک ضبطِ تحریر میں آئی ہوئی چیزیں شامل ہیں۔ ایک عبوری دور سے عبارت پچپن سال کے دوران وقتاً فوقتاً لکھی گئیں ان نو جلدوں کی جداگانہ تاریخوں کو حسب ذیل طریقہ پر پیریاڈیکل یا عہد بعہد کی نشاندہی میں لایا جاسکتا ہے:۔

۱۔ خزینۂ امین میں شامل یادداشتوں کی پہلی جلد (جدید اصطلاح میں پہلی ڈائری) کا اولین صفحہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۷ء کے روز اور آخری صفحہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے روز تحریر کیا گیا ہے۔ سال ۱۹۳۷ء

اُن کی اولاد سے قاضی میر ابراہیم فرزندِ قاضی سکندر پہلا شخص تھا جو بچھ کے عرف سے معروف ہوا۔ بچھ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ میر ابراہیم کی طبیعت بلغمی تھی اور مادۂ غلیظ کو رفع کرکے بلغم کو جذب کرنے کے لیے وہ ایک قسم کی گھاس چبایا کرتے تھے جسے کشمیری زبان میں بچھ کہتے ہیں" آیئے اب ذرا دیکھیں کہ فوق صاحب اور اُنکے پیشرو شعری صاحب کا یہ بیان، دربیان سلسلہ اور اُنکی آسان پذیرائی کا اقدام کس کس لحاظ سے کھٹکتا ہے:۔ ع۱ چنگیز خان کے نام سے پہلے اعزازاً جہانستان لکھنا ویسی ہی حماقت کا ارتکاب معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے کوئی ایک سفاک اور ظالم کے نام کے ساتھ لعنتُ اللہ علیہ کے بدلے خدانخواستہ رحمت اللہ علیہ لکھدے۔ ایسی کوتاہی کشمیر کے بعض نامور مورخوں سے بھی سرزد ہوگئی ہے انہوں نے اپنے دبے ہوئے جذبات اور مغلوبِ اغیار رہے ہوئے اجتماعی لاشعور کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے ہلاکو خان جیسے بدنامِ زمانہ ستمگر کے ۱۳۲۰ء میں غارتگرِ کشمیر بننے والے پوتے ذلچو کو اعزازاً ذوالقدر خان (باقی اگلے صفحہ پر)

میرا سالِ ولادت ہونے کے ناطے صرف میرے لئے ہی دلچسپی کا سبب نہیں ہے بلکہ اُن سب کے لئے یہ سال دلچسپی کا سامان اپنی گرہ میں چھپائے بیٹھا ہے جو برصغیر ہند میں ایک الگ وطن مانگنے والے مسلمانوں کے خاص تقاضا کو علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار سمجھنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اور جو ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے پیش کی گئی اقبال کی قرار دادِ الٰہ آباد کے اس کلیدی جملے سے واقف ہیں کہ "I THEREFORE DEMAND – FORMATION OF A CONSOLDATED MUSLIM STATE IN THE BEST INTEREST OF INDIA AND ISLAM.

یا جو قائداعظم محمد علی جناح اور ابوالکلام آزاد کے نظریات میں پائی جانے والی بنیادی تفاوت کو جاننے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی طرح سے خزینۂ امین کی اس اولین دستیاب جلد کے خاتمے کی تاریخ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء نابغۂ روزگار شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کی تاریخ وفات ہونے کے ناطے خصوصی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ قبل الذکر سال اور بعد الذکر تاریخ سے متعلق دو انگریزی لکھنے کے علاوہ (بزدل راجہ سہدیو کو بطرف کشتواڑ بھگانے کے حوالے سے) اپنے ساتھ منسوب کرنے کا ایسا زیرِ لب تاثر بھی دیا ہے جس کو پڑھ کر غیر مسلم بہ آسانی یہ تاثر لے سکتے ہیں کہ جیسے مزاجِ مسلمین خدانخواستہ فطرتاً غارت پسند رہا ہے۔ ع۲ اپنی مذکورہ کتاب میں فوق صاحب صفحہ ۱۳۱ پر اس بات سے بخوبی واقف ہونے کا احساس دلاتے ہیں کہ جب کسی کے نام سے پہلے "میر" لکھا ہوتا ہے تو وسطِ ایشیا، اور برصغیر میں صدیوں سے رائج روایت کے تحت وہ اُس کے سید ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ ذات نما لفظ "میر" کسی کے ماقبل بنائے جانے کے برعکس مابعد بنا کر لکھا جاتا ہے تو یہ لفظ اُس شخص کا امیر زادہ یا میرزا زادہ ہونا ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مابعد والا "میر" "امیر" یا "میرزا" کا مخفف ہے۔ اب "کچھ خاندان سے متعلق عبارت کے حوالے سے دیکھئے کہ پانچ صفحے لکھنے کے بعد ہی فوق صاحب کتنے تضادات کے شکار ہو گئے ہیں پہلا تضاد یہ ہے کہ خواجہ حسن شعری کے جس بیان کو (باقی اگلے صفحہ پر)

اقتباس خزینہ کی دوسری جلد کا تفصیلی تعارف پیش کرنے سے پہلے ہی نذرِ ناظرین کیئے جائیں گے۔ اقبال اکیڈمی کی سطح پر خزینہ کی پیشِ نظر ترتیب و اشاعت جلد ہی یقینی بنانے کی غرض سے ہم نے اس اولین جلد کے ٹائیٹل کور پر لال سیاہی سے انگریزی گنتی کا جلی 1 بطور خاص نمبر لکھوایا ہے۔ اسلامی کلینڈر کی رو سے یہ جلد بڑھ صاحب کے ۱۷، شعبان المعظم ۱۳۵۶ھ سے ۲۰، ماہ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ تک کے منتخبات مطالعہ پر محیط ہے۔

۲۔ خزینۂ امین کی دوسری جلد کو ہم نے لال سیاہی سے A 4 نشان رکھوایا ہے۔ اس جلد میں درج عبارات کا عرصۂ تحریر ۲۸، اکتوبر ۱۹۵۵ء سے ۲۳، نومبر ۱۹۶۷ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جلد میں شامل اردو فارسی اور انگریزی منتخباتِ مطالعہ اور تاثراتِ مؤلف فکرِ انگریزی اور بوقلمونی کے اعتبار سے نمائندہ حیثیت کے حامل ہیں۔ گویا اس ایک جلد کے تعارف و تجزیے سے دوسری تمام جلدوں کے موضوعات مواد اور نقد و تبصرے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔" دلکشا" میں منعقد کی گئی نشست کے خاتمے پر انفرادی رائے زنی کیلئے من وعن تسلیم کیا گیا ہے اس کی رو سے" بچھ " خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام میر محمد علی ہے۔ لیکن وہ سید نہیں ہے۔ حالانکہ عہدِ حاضر کی روایت شکن روش کے برعکس عہدِ دیرینہ شاہی (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) میں لفظِ میر کے محتاط استعمال کو ملحوظ رکھے جانے کی پابندی مسلم تھی۔ مثلاً میر محمد ہمدانیؒ اور خواند میر جیسے نام اس عہد کے پس و پیش ہیں۔ اب فوق صاحب کے بدلے کون کہے کہ میر بر سر مورثِ اعلیٰ والے چنگیزی الاصل بچھ خاندان کو کیوں سید قرار نہیں دیا گیا؟ اور یہ خاندان از خود ایک تجارت پیشہ علم دوست خاندان ہونے کی دیرینہ معروف پہچان پر ہی کیوں اکتفا کرتا رہا۔ دوسرا التضاد یہ ہے کہ میر ابراہیم کی بلغمی طبیعت کے حوالے سے بچھ لفظ کو کشمیری زبان کا لفظ قرار دے کر اختراعی جسارتِ بیجا کا ارتکاب بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ کشمیری لغت میں سرے سے ہی وجود نہ رکھنے والے اس لفظ کو " کچھ " (گھاس پھوس) کے مفہوم سے نوازا گیا ہے اور اسکی حکیمانہ خاصیت بھی بیان فرمائی ہے اور یوں ٹھیٹھ کشمیری لفظ " بڑھ " سے (باقی اگلے صفحہ پر)

ایک ایک جلد اُٹھاتے وقت میں نے ترجیحاً اِسی جلد کو اُٹھالیا جبکہ اس سے ماقبل والی جلد اقبال اکیڈمی کے صدر پروفیسر غلام رسول ملک صاحب کو تفویض کی گئی موعود تفصیلی مطالعہ کا تاثر پیش کرنے سے پہلے میں زیر مطالعہ جلد 1A کی نمایندہ حیثیت کے تعلق سے فقط دو چھوٹے سے اقتباس یہاں پر پیش کرتا ہوں، اس جلد کے اردو حصے کا آغاز مرحوم بڑھ صاحب کی ان خود تعارفی سطروں سے ہوتا ہے جن میں اپنی تحریرات کے مقاصد و اہداف کا تعین اِن الفاظ میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"میرے منتخباتِ مطالعہ۔ (بشمولِ) میرے اپنے تاثراتِ مطالعہ کے اور میری ذاتی ڈائری (بشکلِ) زندگی کی مختلف النوع نیرنگیوں کے تاثرات۔ یہ سب میں وقتاً فوقتاً قلمبند کرتا ہوں، دیانتداری کے ساتھ، بغیر کسی خوف اور جھجک کے، تاکہ میرے مرنے کے بعد یہی سامان میری ذاتی ملکیت ہو جو میرے گھر سے نکلے جس سے آگاہی ہو کہ میرے دن اور میری راتیں کیسے گذری ہیں۔ ام ی ن عفی اللہ عنہ" خزینۂ امین کی اس جلد کے انگریزی حصے کا آغاز برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے ایک الگ وطن مانگنے کی تجویز سے متعلق بنیادی معلومات یوں بہم پہنچانے سے ہوا ہے۔

IQBAL IN MAY 1937 IN A LETTER TO

صرفِ نظر کیا گیا ہے جس کا مفہوم بازو کا کہنی سے کندھے تک پھیلا ہوا حصہ ہے۔ جس کو جسمانی طاقت کا مظہر ہونے کے ناطے مڑھ بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً مڑھ بل اور مڑھ گنڈ جیسی ترکیبوں میں۔ اعضائے بدنی کے نام وضع کرنے والوں نے متصل حصہ بغل کے لیے کڑھ بولے جانے والے لفظ سے بڑھ اور مڑھ کو ہم قافیہ بنایا ہے۔ تیسرا تضاد یہ ہے کہ صفحہ ۱۳۵ پر ویلی آف کشمیر کے مصنف سر والٹر لارنس کے اس بیان کی پذیرائی کر لی گئی ہے کہ کشمیر میں آباد ہونے والے مغلوں کی صرف پانچ ذاتیں ہیں ۱۔ میر ۲۔ بیگ یا میرزا ۳۔ بانڈے ۴۔ بچھ اور ۵۔ عشایی۔ یہاں پر فوق صاحب نے میر لفظ کو میرزا کا مخفف کیوں نہ جانا اور میرزا کو بیگ کا نعم البدل کیوں تسلیم کیا؟ واللہ اعلم بالصواب ٭٭

QAIDI AAZAM SAYS:- " AFTER A LONG AND CAREFUL STUDY OF ISLAMIC LAW, I HAVE COME TO THE CONCLUSION THAT IF THIS SYSTEM OF LAW IS PROPERLY UNDERSTOOD AND APPLIED, AT LEAST THE RIGHT TO SUBSISTENCE IS SECURED TO EVERYBODY. BUT THE ENFORCEMENT AND DEVELOPMENT OF THE SHARIAT OF ISLAM IS IMPOSSIBLE IN THIS COUNTRY, WITHOUT A FREE MUSLIM STATE OR STATES. THIS HAS BEEN [redacted] HONEST CONVICTION FOR MANY YEARS AND I STILL BELIEVE THIS TO BE THE ONLY WAY TO SOLVE THE PROBLEM OF BREAD FOR MUSLIMS AS WELL AS TO SECURE A PEACEFUL INDIA.."

۳۔ خزینۂ امین کی تیسری جلد کو ہم نے ٹائیٹل کور پر سرخ سیاہی سے جلی طور پر 2 نشان رکھا ہے۔ اس جلد کا عرصۂ تحریر ۹، دسمبر ۱۹۶۷ء سے ۲۵، اپریل ۱۹۶۹ء تک پھیلا ہوا ہے

۴۔ خزینۂ امین کی چوتھی جلد کو 3 نشان رکھا گیا ہے۔ اس کی تحریرات ۲۵، اپریل ۱۹۶۹ء سے شروع ہو کر ۶، مارچ ۱۹۷۰ء کو خاتمہ پذیر ہوتی ہیں۔

۵۔ خزینۂ امین میں شامل پانچویں جلد کو ہم نے جلی سرخی میں 4 نشان رکھا ہے یہ جلد بڈھ صاحب کے منتخبات اور تاثرات درمیانِ عرصۂ ۱۵، اپریل ۱۹۷۰ء تا ۲۵، ستمبر ۱۹۷۰ء پر مشتمل ہے۔

۶۔ خزینۂ مذکور کی چھٹی جلد کے چہرے پر 5 کا نشان رکھا گیا ہے اس میں ۱۵، مئی ۱۹۷۹ء سے ۱۱، نومبر ۱۹۸۱ء تک کی منتخبہ عبارتیں محفوظ کرلی گئی ہیں۔

۷۔ خزینۂ امین میں شامل ساتویں جلد کو ہم نے 5A کا نشان رکھا ہے اس کا عرصۂ تحریر ۱۵، نومبر ۱۹۸۱ء سے ۳، جولائی ۱۹۸۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔

۸۔ خزینۂ امین کی آٹھویں جلد کے چہرے پر 7 کا نشان رکھا گیا ہے۔ اس میں شامل اشعار اور اقتباسات کا اندراج ۹، اکتوبر ۱۹۸۵ء اور ۲۰، دسمبر ۱۹۸۷ء کے درمیانی عرصے میں وقتاً فوقتاً کیا گیا ہے۔

۹۔ خزینۂ مذکور کی نویں جلد کو پیش نظر ترتیب واشاعت کی غرض سے جلی سُرخی کے طور پر 8 کا عدد الاٹ کیا گیا ہے۔ اس جلد کے اندراجات کا عرصہ یکم جنوری ۱۹۸۸ء سے اکتیس اگست ۱۹۹۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔

اگرچہ خزینۂ امین کی نو دستیاب جلدوں کا مشترکہ حاوی موضوع اقبالیات سے متعلق منتخبات اور تاثرات پر مشتمل ہے تاہم اِن جلدوں کے ذیلی موضوعات میں اشعار و تشریحات دیگر نگارشات اور کشمیریات کو بھی خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔ ان مختلف النوع منتخبات کی رنگینی کا ایک بوقلموں منظرنامہ پیش کرنے کے لئے چند اقتباسات اور تاثرات کی بازنمائی کرنے سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ البتہ یہ جزوی تعارف تحریر کرتے وقت میں خالصتاً خزینہ مذکور کی دوسری جلد یعنی جلد 1A پر انحصار کر رہا ہوں اس توقع کے ساتھ کہ تمام جلدوں کے حُسن و قبیح کا اندازہ اس ایک ہی جلد کے تحصیل حاصل کی پیشکش پر غور کرنے سے بھی بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

خزینۂ امین کی زیرِ نظر جلد (1A) ضخامت میں دوسری تمام جلدوں سے بڑی ہے۔ اِس کا حجم ½12" × 6" × 1" ہے۔ یعنی اسکی لمبائی ½12 انچ، اسکی چوڑائی 6 انچ اور اسکی موٹائی ایک انچ ہے۔ موٹی جلد والی یہ دلچسپ دستاویز عام رجسٹروں کے برعکس ایک نادر

اور کمیاب طرز کے روزنامچے کی تحریر کے لیئے بنائی گئی رجسٹر ہے۔ چنانچہ بائیں طرف سے اسکے تقریباً ۱۲۸ صفحے انگریزی ابجد کی صفحاتی ترتیب کے حاشیوں A/B سے ترتیب دئے گئے ہیں ازاں بعد بقیہ یادداشت کے لیئے انگریزی گنتی کے جلی عددوں والے ۱۵۰ صفحات مبنر مائیل لکیردار موٹے کاغذ کے رکھے گئے ہیں۔ اس جلد کے پورے ۲۷۸ صفحے خواجہ محمدامین بڑھ مرحوم کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔ نہایت خوبصورت عبارت اور عالمانہ دستخط میں لکھے گئے ان صفحات کے لئے ایک ہی قلم اور ایک ہی سیاہی (PARKER BLUE BLACK INK) کا استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ جلد بڑھ مرحوم کے علم وفضل، افتادِ طبع، ریاضت ومشقت اور سلیقہ ونفاست کی بہت اچھی آئینہ داری کرتی ہے اور انکے منتخبات کی وسعت ورنگینی کا بخوبی اندازہ کراتی ہے۔ گویا اس ایک ہی جلد کے جامِ جم سے برآمد ہونے والے جلوے بڑھ صاحب کے معاصر کشمیریوں کے علاوہ برصغیر کی جدید تاریخ ساز شخصیتوں کو پہچاننے میں بھی اُتنے ہی مفید ومعاون دکھائی دیتے ہیں جتنے یہ جلوے سرزمین مشرق کے بعض قدیم ثقافت نواز شاعروں اور ادیبوں کو پہچاننے میں محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً برصغیر کے مسلمانوں کی جدید تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال جیسے قدآور لوگ۔ پہلے اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ علامہ اقبال اور قائدِاعظم ایک دوسرے کو کس نظر سے دیکھتے تھے تو بڑھ صاحب کے فراہم کردہ ان الفاظ پر غور کرنا کافی ہوگا۔

(A) IQBAL WROTE TO QAID AAZAM IN JUNE 1937 (SAY TEN MONTHS BEFORE HIS DEATH):-

" YOU ARE THE ONLY MUSLIM IN INDIA TODAY TO WHOM THE COMMUNITY HAS A RIGHT TO LOOK UP FOR SAFE GUIDANCE THROUGH THE STORM WHICH IS



امین صاحب دمام میں اپنی پوتی کے ساتھ

Title ______________________

Author ______________________

Accession No. ______________________

Call No. ______________________

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



فریضۂ حج کے دوران امین صاحب اپنے ایک قریبی رشتہ دار میر غلام حسین صاحب
اور اپنے بھائی غلام نقشبند کے ساتھ

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

COMING TO NORTH-WEST INDIA, AND PERHAPS TO THE WHOLE OF INDIA."

(3) QAIDI AAZAM JINAB SENT THE FOLLOWING MESSAGE TO IQBAL'S SON ON THE DEATH OF THE POET :-

"TO ME IQBAL WAS FRIEND, GUIDE AND PHILOSOPHER AND DURING THE DARKEST MOMENTS THROUGH WHICH THE MUSLIM LEAGUE HAD TO GO, STOOD LIKE A ROCK AND NEVER FLINCHED ON SINGLE MOMENT.... IQBAL WAS THE BUGLER OF MUSLIM THOUGHT AND CULTURE. HE WAS THE SINGER OF THE FINEST POETRY IN THE WORLD. HE WILL LIVE AS LONG AS ISLAM WILL LIVE. HIS NOTEABLE POETRY REPRESENTS THE TRUE ASPIRATIONS OF THE MUSLIMS. IT WILL REMAIN AN INSPIRATION FOR US AND FOR GENERATIONS AFTER US." CULTURAL HERITAGE OF PAKISTAN AND IKRAM PAGE 202 SA (29/7/67)

ایک سچے عاشقِ اقبال کی حیثیت سے مرحوم بڑھ صاحب جہاں شاعرِ مشرق کے محبوب مکتبِ فکر کے ہر گوشے پر پڑنے والی روشنی کی طرف پروانہ وار لپکتے رہے ہیں وہاں مخالف مکتبِ فکر کی کوتاہی اور قباحت کو بھی نشاندہی میں لاتے رہے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال پر جو اعلیٰ معیار کا تحقیقی اور علمی کام ڈاکٹر یوسف حسین خان کی روحِ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فکرِ اقبال، سید عبداللہ کی تصنیف رومی اور اقبال یا نیاز الدین خان کی تالیف "مکاتیبِ اقبال

کی مشکل میں منظر عام پر آ گیا اُن کا جوہر بڑھ صاحب نے اپنی یادداشت کی اِسی جلد میں شہد کی مکھی کی طرح یکجا کر لیا ہے۔ لیکن مخالف مکتب فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ کی غرض سے ابوالکلام آزاد کی تالیف تذکرہ اور اُنکی انڈیا وِنز فریڈم کے اُردو ترجمہ یعنی رئیس احمد جعفری کی "آزادیٔ ہند" کا بھی غائر مطالعہ کیا ہے اور اُن کے بعض الفاظ و اشعار کو بھی اس جلد میں جگہ دی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کو اسلامی فکر کے صحت مند معماروں کا درجہ دے کر ابوالکلام آزاد کو مہرۂ اغیار قرار دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ مندرجہ بالا انگریزی سطور میں نظریاتِ اقبال و جناح کی ہم آہنگی سے متعلق ایک جھلک دکھانے کے بعد بڑھ صاحب قائدِ اعظم اور ابوالکلام کے نظریات میں پائے جانے والے بُعد کی ایک جھلک بھی اسی طرح کے حُسنِ انتخاب سے دکھاتے ہیں۔ چنانچہ ۷، اگست ۱۹۶۷ء کے روز خزینۂ امین کے زیرِ نظر حصے (۱۸) میں لکھتے ہیں: "جولائی ۱۹۴۰ء میں جب ہندوستان کی ہندو (غلبے والی) کانگریس نے ابوالکلام آزاد کو دِکھاوے کے لیے اپنا صدر بنا دیا تھا اور اُسے کہا تھا کہ تم مسلم لیگ سے بات چیت شروع کر دو۔ تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ ہندو کانگریس کا صدر ایک مسلمان ہے اور مسلم لیگ کا یہ دعویٰ کہ صرف وہی جماعت مسلمانوں کی نمایندہ ہو سکتی ہے جھوٹ قرار دیا جا سکے..... تو ابوالکلام نے بصیغہ راز قائدِ اعظم کو اُس معاملے سے متعلق ایک تار بھیجا جس کے تحت مسلم لیگ حکومت برطانیہ سے اصرار کر رہی تھی کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے مساوی حقوق تسلیم کر کے ایک عبوری حکومت بنا دی جائے وہی حکومت باقی معاملات طے کرے گی تار کا مقصد بڑھ صاحب کی نظر میں ایک دامِ فریب پھیلانے کا مقصد تھا گویا ایک معاہدے کی آڑ میں مسلم لیگ کو کانگریس کی ایک شاخ بنا کر پیش کرنا اور اسکی حاصل کردہ اہمیت پر شبخون مارنا مقصود تھا۔ یہی حقیقت تاڑنے کے سبب جراٴتِ ایمانی سے لیس قائدِ اعظم نے ابوالکلام کو یہ تُرش جواب ارسال کیا تھا۔

I HAVE RECEIVED YOUR TELEGRAM. I CANNOT RECIPRO-CATE CONFIDENCE. I REFUSE TO DISCUSS WITH YOU BY CORRESPONDENCE OR OTHERWISE AS YOU HAVE COMPLETELY FORFEITED THE CONFIDENCE OF MUSLIM INDIA. CAN YOU NOT REALIZE YOU ARE MADE A MUSLIM SHOW-BOY CONGRESS PRESIDENT TO GIVE ITACOLOUR THAT IT IS NATIONAL AND DEC-EIVE FORIEGN COUNTRIES. YOU REPRESENT NEITHER MUSLIMS NOR HINDUS. THE CONGRESS IS A HINDU BODY. IF YOU HAVE SELF RESPECT RESIGN AT ONCE. YOU HAVE DONE YOUR WORST AGAINST THE LEAGUE SO FAR. YOU KNOW YOU HAVE HOP-ELESSLY FAILED. GIVE IT UP.

برصغیر کی سیاست سے متعلق تلخ نوائی پر مبنی اسی طرح کے بعض واقعات مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، بلراج مدھوک اور شیخ عبداللہ کے حوالے سے بہم کرنے کے باوجود بڑھ صاحب نے اپنی یادداشت کا بیشتر حصہ شعروادب کے لیے ہی وقف کر لیا ہے۔ وہ بھی خصوصاً اقبال شناسی کی راہ روشن کرنے والے شعروادب کے لیے۔ البتہ اس دائرے میں نہ آنے والی کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت بھی مرحوم بڑھ صاحب پوری دیانتداری اور غیر جانبداری سے نقد و نظر کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کی فارسی تصنیفات اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم۔ پس چہ باید کرد۔ مسافر۔ جاوید نامہ اور ارمغان حجاز کے اشعار منتخب کرتے ہوئے دوسری کئی کتابوں پر بھی اپنے بے لاگ تاثرات قلمبند کرتے گئے ہیں۔ مثلاً خزینۂ امین کی اسی جلد (۱۸) کے

منتخبات مطالعہ میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی نفسیات سے متعلق تصنیف "ہم آپ" غلام رسول مہر کی تالیف "سید احمد شہید" پروفیسر اکرام کی کلچرل ہیریٹیج آف پاکستان ٹو سٹیز اینڈ کشمیر آف برڈ ووڈ۔ دی میموریس آف آغاخان اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی فرینڈس ناٹ ماسٹرس جیسی کتابوں پر رائے زنی کرتے وقت بھی محمد امین بزمؔ انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ البتہ جہاں وہ کسی قلمکار کو ذہنی افلاس، اخلاقی پستی اور جنسی بے راہ روی کا آلہ کار یا پرچارک بنتے دیکھتے ہیں وہاں اُس کو فوری طور پر آڑے ہاتھوں لینے سے کبھی نہیں چوکتے۔ بزمؔ صاحب کے اس غازیانہ رویہ کی ایک ٹھوس مثال اخبار سندیش کے نائب مدیر اور جموں کے ایک صحافی نُما ناول نویس موہن یاور کے "سیاہ تاج محل" نامی سیاہ کارنامے پر آپ کی وہ بے لاگ تنقید ہے جو ۱۰ رمئی ۱۹۶۲ء کے اخبار خدمت میں منظرِ عام پر آگئی ہے۔ نمونے کے طور پر اُس تنقید کی یہ چند سطریں "خزینۂ امین" جلد ۱۵ کے صفحات ۶۹/۶۸/۶۷ سے نقل کرکے پیش کی جاتی ہیں۔ "سیاہ تاج محل جموں کے ایک جرنلسٹ افسانہ نویس کے بارہ افسانوں یا سیاہ کارناموں کا ایک مجموعہ ہے، افسانوں کی زبان کمزور اور پھسپھسی بلکہ غلطیوں سے پُر ہے.... علامہ اقبال پر اللہ کی بے پایاں رحمت ہو۔ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس   آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

انہی افسانہ نویسوں میں "سیاہ تاج محل" لکھنے والے کا شمار ہو سکتا ہے۔ جس کے اعصاب پر عورت بُری طرح سوار ہے اور وہ بھی ایک بدکار و ننگِ وطن اور ننگِ انسانیت آوارہ عورت..... افسانہ نویس کھُلے بندوں آوارہ گی، بدمعاشی اور بدچلنی کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اس کا قلم زِنا کو عام کرنے کے لیے بیقرار ہے۔ وہ قوم کی نوخیز اور جواں سال لڑکیوں کو آوارہ گی کے گر سِکھلاتا ہے اور یہ کہ وہ شادی بیاہ کے "پوِتر بندھن" میں اپنے آپ کو پابند نہ کریں.... مائیں نہ بنیں۔ بچے نہ جنیں بلکہ..... جنسی آزادی کو برقرار رکھکر خوشنما چڑیوں کی طرح ٹہنی ٹہنی پر چہکیں اور جہاں کوئی تناور پیڑ نظر آئے وہاں تھوڑی دیر کے لیے آشیانہ

بنائیں اور جنسی پیاس کو بجھا کر، اپنے جی کو بہلا کر پھر دوسرے پیڑ پر چلی جائیں ..... خدا نہ کرے کہ اس جیسے افسانہ نویس کی بے تکی باتوں پر کوئی کان دھرے ورنہ عزتِ آدمیت اور بقائی نسلِ انسانی کا انقطاع یقینی بن جائیگا اور مشرق کے قابلِ صد ناز تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہوگا ہماری تہذیب کا لُبِ لباب یہ ہے کہ ؎

سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد　　　　سترِ مردان حفظِ خود از یارِ بد

یہ الفاظ لکھنے کے بعد بڑھ صاحب مذکورہ ناول کے چار اقتباس پیش کر کے موہن یاور کی آوارہ ذہنی کو طشت از بام کرتے ہیں اور اپنے تبصرے کو دو آتشہ بنانے کے لیے لمبی آہ بھر کر لکھتے ہیں "یہ ہیں ہمارے افسانہ نویس جو سماج کے اخلاق کو سنوارنے کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں اور جو در اصل قابلِ صد نفریں زنا نواز تمدن کے نمائندے ہیں۔ انکی عریاں نویسی ہی ذمہ دار ہے سماج میں اخلاقی برائیوں کی، جنسی بے راہ روی کی ملک میں تہذیبی گراوٹ کی اور قوم میں پستی کردار کی۔ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو۔ یہی لکھنے والے ہیں جو واقعتاً ؎

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند　　　　کرتے ہیں رُوح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل اُن کا　　　　اُن کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار"

بُرے قلمکاروں کی زہریلی تحریروں سے بچنے اور اچھے قلمکاروں کی روح نواز تحریروں سے فیضیاب ہونے کی کوشش کرتے رہنے کا جو مشورہ مرشدِ مرشدان مولانا رومی نے حق کے ہر متلاشی کو ان الفاظ میں دیا ہے ؎

دستِ ہر نااہل بیمارت کند　　　　سوے مادر آ کہ تیمارت کند

اِسی مشورے کی پذیرائی کر کے مرحوم محمد امین بڑھ اچھے شاعروں کے اشعار بڑی عقیدت اور حسنِ ظن سے منتخب کرتے رہے ہیں چنانچہ مرزا غالبؔ کے اس تجربے کے باوصف کہ ع "شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے" وہ ایک گونہ حسنِ انتخاب کو اپنے خزینہ میں بڑی خوبی سے یکجا کر سکے ہیں، کئی اشعار ایک سے زیادہ بار بھی نقل کیے گئے ہیں۔ تاہم بڑھ صاحب

کے ذوقِ سلیم اور معیارِ شعر شناسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ انہوں نے کس پائے کے شاعروں کا زرِ گل اپنے کشکول میں جمع کر لیا ہے۔ خزینۂ آین کی زیر نظر جلد (۱۸) کے مطالعے سے بھی اُنکے محبوب شاعروں کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ اس جلد میں فارسی، اردو اور کشمیری کے جن شاعروں کا منتخبہ کلام درج کیا گیا ہے ان میں یہ سب نام شامل ہیں۔ حکیم سنائیؔ، مولانا رومیؔ، شیخ سعدیؔ، امیر خسروؔ، حافظ شیرازیؔ، مولانا جامیؔ، پیر پیران سید عبد القادر جیلانی، خواجہ بہاء الدین نقشبند، خواجہ معین الدین چشتی، خاقانیؔ، عراقیؔ، منوچہریؔ، ظہوریؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، میرزا بیدلؔ، میر تقی میرؔ، قدسیؔ، عزت بخاری، مولانا حالیؔ، اکبرالہ آبادی، غنی کشمیری، شیخ سرمدؔ، وصالیؔ، گرامی علامہ اقبالؔ، حفیظ جالندھری، مولانا ظفر علی خان، مرزا محتشم خان فداؔ، حسرت دہلوی، عابد علی عابدؔ، فیض احمد فیضؔ، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، جگن ناتھ آزادؔ، مولانا حیرتؔ کاملی، میر غلام رسول نازکیؔ، سید مبارک شاہ فطرتؔ گیلانی، عبد الحق برق، پیر عبد القادر آثمؔ، آنند نرائن مُلّا اور جگن ناتھ آزادؔ۔ ان سب شاعروں کے منتخب کئے گئے اشعار جہاں مرحوم بڈھ صاحب کی خاص افتاد، خاص شعر شناسی اور خاص معرفتِ نفس کا باوقار مظاہرہ کرتے ہیں وہاں اُن شعروں کو آپکے تاثرات کے سمیت اپنی اصل صورت میں پڑھنا کچھ اور ہی لُطف دیتا ہے۔ اُس لطف میں شریک ہونے کے لئے ہمارے قارئین کو خزینۂ آین کے بالاقساط منظرِ عام پر آنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ بلکہ اُن تاثرات سے محفوظ ہونے کے لئے بھی جن کو بڈھ صاحب نے ۱۸ میں یہ عنوان دیئے ہیں۔ جناح کا خلوص (37) جہاں گلا کا جھوٹ (ص 5) خضر سوچتا ہے .... (ص 3) مسلمانوں کا کوئی ہمدرد نہیں۔ جدید ہندوستان کی بے حیائی، ہولناک جنگ، شیخ عبد اللہ کا اظہار۔ جن سنگھ کی دُرگت ہندو کی سیاست۔ بہرحال طوالت سے بچنے کے لئے میں اس جزوی تعارف کو چند ایسے نثری اقتباسوں پر ختم کرنا چاہوں گا۔ جو اقبال شناسی کے علاوہ کشمیر اور فلسطین جیسے مسائل

سے متعلق بھی چند نازک باتوں کے چہروں سے پردے سرکاتے ہیں۔ اور جو مرحوم بڑھ صاحب کے مختلف تجربات اور میلانات کی بھرپور عکاسی بھی کرتے ہیں۔ یہ چند اقتباس خزینۂ امین کی صرف جلد ۱۸ سے لئے جاتے ہیں :۔

۱۔ اقبال نے مشرق و مغرب کو محض سیاسی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ عمرانی اور فکری زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا۔ ایک ایسے دانائے راز کے زاویۂ نگاہ سے جو زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتا ہے۔ اور ماضی و حال کے تمام اہم سر رشتوں کو ملا جُلا کر اُن سے اہم ترین بنیادی حقائق کا سراغ لگاتا اور آیندہ اِمکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اقبال کا فکر صرف مشرق یا مغرب ہی نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کو محیط ہے (۱۸ ص 148)

۲۔ کل ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو سرینگر ریڈیو سے ایک مجلسِ مشاعرہ کی کاروائی نشر کی گئی۔ مقامی حکومت اور بھارتی حکومت کے گیت گائے گئے۔ اکثر شعراء نے قصیدہ خوانی کی اور اپنے آقایانِ ولی النعمت کی تعریفیں کرکے اپنی "نمک حلالی" کا ثبوت دیا۔ صرف ایک شاعر (نام بھول گیا ہوں) نے کشمیریوں کی واژگون حالت کا صحیح نقشہ ان تین اشعار میں یوں کھینچا ؎

دم بخود ہیں پیمبرانِ بہار   آتش آلودہ پیش و پس ہے وہی
ایک ہم ہیں چمن نصیبوں میں   اپنے دامن میں خار و خس ہے وہی
دل کی دھڑکن جو زیرِ لب تھی کبھی   کارواں کارواں جرس ہے وہی

میں نے پٹھانکوٹ میں بیٹھ کر یہ مشاعرہ سُنا یہ تین اشعار پسند آئے۔ اخبار پر پنسل سے نوٹ کئے آج وہاں سے واپس آیا اور یہاں درج کئے (ص ۱۴۴)

۳۔ ؎ یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور   تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تصوف کے خیالات جو شاعری کے ذریعے اسلامی ملکوں میں پھیلے۔ اُن میں زندگی سے گریز (بھاگنے) کی تعلیم تھی.....اِگی نسبت علامہ اقبال نے (نثر میں بھی) اِس طرح اظہارِ خیال کیا ہے :۔

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط (زوال) کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے۔ جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اُس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اُس کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اِس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سُستی اور کاہلی اور اُس شکست کو جو اُن کو تنازع البقا (STRUGGLE FOR SURVIVAL) میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیئے کہ اُن کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنو کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(اقبال نامہ ص ۴۴) (A ص 133)

۴۔ اقبال نے "اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)۔ میں آدم کے جنت سے نکالے جانے کی نہایت ہی بلیغ تفسیر پیش کی ہے وہ کہتا ہے کہ جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کے اُس ابتدائی دور سے عبارت ہے۔ جبکہ اُس میں احساسِ خودی پیدا نہ ہوا تھا اور اس نے اپنے ارادہ و علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہیں سیکھا تھا اس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ دراصل اُس حقیقت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلی میلانات کے دائرہ سے باہر قدم نکالا اور ایک آزاد اور با اختیار الیغو (EGO) کا مالک بنا۔۔۔۔ آدم کی نافرمانی اُس کے لئے ایک سبق تھی۔ اس طرح اُس نے اپنے اختیار و ارادہ کو برتنا سیکھا۔ اس لئے اُس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا آدم کیلئے کُلفت و زحمت کی جگہ بنائی گئی تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا پائے۔ یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے۔۔۔۔ اسلام کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے اخلاق کو زندگی کا محرک اور تاریخ کو انسانی اعمال کا فیصلہ قرار دیا۔ اسلام نے انفرادی ذمہ داری اور سعی و عمل کو زندگی کا اصلِ اصول قرار دیا۔ عمل سے ہی انسان کی ظاہری



کشمیر یونیورسٹی کی ایک ادبی تقریب میں امین صاحب، پروفیسر ضیا الحسن فاروقی، بلراج پوری،
شمس الدین احمد اور بشیر احمد نحوی کے ساتھ۔

Title ____________________

Author ____________________

Accession No. ____________________

Call No. ____________________

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



امین صاحب اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کے ایک جلسے کی اختتامی تقریب میں۔ امین صاحب کے بائیں جانب۔
ڈاکٹر نظام الدین۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ غلام محمد خان۔ بشیر احمد نحوی۔ ڈاکٹر چمن لال رینہ۔
محترمہ بیگم سرور۔ پروفیسر رشید نازکی۔ پروفیسر محمد امین اندرابی۔ عابد حسین اور ڈاکٹر بدر الدین بٹ
دیکھے جا سکتے ہیں۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

اور باطنی خوبیاں نمایاں ہوتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو ملائکہ کا مسجودُ ہونے کا مستحق ثابت کرسکتا ہے۔ (۱۸ ص 130)

۵۔ محی الدین ابن عربی اور عبدالکریم جیلی نے انسانِ کامل کے تصور پر بحث کی ہے۔ جیلی نے اپنی کتاب "الانسان الکامل فی معرفتہ الاواخر والاوایل" میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالم ہے۔ جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے..... جیلی کا عقیدہ تھا کہ باوجود نیابتِ الٰہیہ کی اہلیت رکھنے کے انسان ذاتِ باری کی شانِ سرمدیت میں شریک نہیں ہوسکتا جیلی عقیدہ حلول کا قایل نہ تھا۔ اُس کے نزدیک "انسانِ کامل" عرض کی حدود سے نکل کر جوہر کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اُسکی آنکھ خدا کی آنکھ، اُس کا کلام خدا کا کلام اور اُسکی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر انسان اللہ کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو اِسطرح استوار کرے کہ اُس کے سارے افعال و اعمال میں خدا کے ہی مشاہدے اور حضور کی کیفیت حاصل ہو تو یہی عینِ دین ہے۔ تعبد میں تجرد کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ انسان ذاتِ واجب کے وجودِ علمی سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ شہود اُس پر اِسقدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اُس کا وجود الٰہی وجود بن جاتا ہے۔ اقبال اس خیال کو بالِ جبریل میں یوں پیش کرتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفرین کارکُشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

..... اِنسانِ کامل اپنی سعی و عملی اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گذر کر نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے اور عناصر پر اپنی حکمرانی کا سکّہ جماتا ہے ...... انسانِ کامل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجازِ عمل سے تجدیدِ حیات کرتا ہے۔ اُسکی فکر زندگی کی خوابِ پریشان کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ پُرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا اور حقائق کی نئی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ وہ تاریخ کی تخلیقی رَو کو اپنے حسبِ منشا، جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اُس کے ذریعے اِنسانی صفاتِ عالیہ کا اظہار تاریخ میں اعلیٰ سیرت کی شکل میں ہوتا ہے.... ۸ ص 127/126

۶۔ ..... ہالینڈ، فرانس، جنوبی امریکہ کے ممالک۔ کینیڈا، ہندوستان سب ممالک نے سلامتی کونسل میں اور سلامتی کونسل سے باہر اسرائیل کے نقطۂ نظر کیساتھ اتفاق کیا۔ امریکہ اور برطانیہ نے کھلے بندوں اُس یہودی ملک (اسرائیل) کی معاونت کی۔ گویا عربوں یا مسلمانوں کا اللہ کے سوا کوئی حامی وناصر نہیں ہے۔ (کرنل ناصر جیسے دین دشمنوں کی روش سے اُن کا شیرازہ ہی بکھر گیا ہے) مسلمان ممالک مثلاً پاکستان، ایران، ترکیہ اور انڈونیشیا نے عربوں کی اخلاقی مدد تو کی۔ لیکن مادی مدد دینے سے انہوں نے قدرتی طور تامل سے کام لیا۔ کیونکہ اول تو (فلسطین اور یروشلم پر اسرائیل کے قابض ہونے کے) اس معاملہ کو اسلامی نظریہ کا حامل بنانے کی ناصر اور دوسرے عربوں (اقتدار پرستوں) نے سختی سے مخالفت کی تھی اور دوئم یہ کہ ناصر کی کج فہمی نے ساری دنیا کی دشمنی مول لی تھی، حالانکہ اُسے پچھلے چند برسوں سے بہ اصرار کہا گیا تھا کہ عرب لیگ کا یورپی وطنیت والا راگ الاپنا چھوڑ دو۔ اور سارے عالم اسلام کے ساتھ ناطہ جوڑ دو۔ عرب لیگ کو اسلام لیگ یا موتمر عالمِ اسلام میں بدل دو اور سارے مسلمان ممالک کے ساتھ متحد ہو جاؤ تاکہ ارضِ مقدس کو بچانے کا بالاتفاق اہتمام کیا جا سکے۔ (لیکن فرعونی نسل ہونے پر ناز کرنے والے اُس پروردۂ کفر سیاہ دل ناصر پر اور اُس کے معاصر نام نہاد مسلمان حکمرانوں پر اخوان المسلمین جیسی حق پرست تنظیموں کی اِس بات کا کوئی اثر نہ ہوا)

۷۔ لاکھوں نمرود ہوں۔ کروڑوں فرعون ہوں ..... یا کھربوں ابوجہل ہوں ہم سُنّتِ ابراہیمی، سُنّتِ موسوی اور سُنّتِ محمدیؐ پر جادہ پیما ہو کر اُن سب شیطانوں اور ابلیسوں کو نیچا دکھائیں گے۔ انشاء اللہ۔ ہم نے آج تک بھی ہمیشہ دنیا کو دکھا دیا ہے کہ ہم باطل سے دبنے والے نہیں ہے تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں / آسان نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا۔ ہمارا کاروان آگے کو جا رہا ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا نام اسلام ہے۔ ہماری کُنیت اسلام ہے۔ ہمارا وطن اسلام ہے۔ ہمارا مقصدِ حیات اسلام ہے۔ ہمارا حاصلِ دوجہاں اسلام ہے ہم ایک منظم اور مربوط کاروان کے افراد ہیں ہے

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا　　اُس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

وَصَلی اللّٰہ علیٰ سیدنا محمدؐ وعلیٰ آلِ محمدؐ واصحاب سیدنا محمدؐ وبارِک وسلِم علیہم۔

اِس وقت کشمیری مسلمان کربلا کے معرکے سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف نیرو جیسا یزیدِ لعین اور اُسکی فوج صف آرا ہے اور دُوسری طرف کشمیری مسلمانوں میں حسینی رُوح بیدار ہو رہی ہے اور انشاءاللہ ؎ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد (۲۱، جولائی ۱۹۶۱ء) ۸/۱ ص ۶۹

۸۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ۱۹۴۶ء میں لارڈ ماونٹ بیٹن نے (قائدِ اعظم) محمد علی جناح کے متعلق رائے دریافت کی۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ وہ ایک اوسط درجے کا وکیل ہے۔ ہندوستان کے وکیلوں میں اُس کا کوئی مُمتاز درجہ نہیں۔ البتہ چند سال سے اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو اپنے ساتھ ملا کر ہندوستان کی سیاسیات میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہندو کی عادت ہے کہ وہ دوسروں کو حقیر اور ہیچ سمجھتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں شکست کھاتے ہیں اور ہر محاذ پر مار کھاتے ہیں ــــ جس لیڈر کو نہرو نے ایک معمولی وکیل بتایا۔ تاریخ نے دیکھ لیا کہ وہ کامیاب و کامران ہوا۔ حُسنِ نیت، حُسنِ تدبُّر اور حسنِ عمل سے .... اُس عظیم المرتبت قائد نے مسلمانوں کو ایک الگ گھر بنا کے دیا.... گاندھی، نہرو، پٹیل اور راجندر پرشاد سب ہندوُں نے یہی کہا کہ پاکستان گو وجود میں آگیا لیکن اس کی عمر چھ ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ چودہ سال سے پاکستان ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔ اپنے مخصوص راستے پر گامزن ہے اپنے اسلامی موقف پر قائم ہے اور اقوامِ عالم میں ایک ممتاز درجے کا مالک ہے۔ ۲۲، جولائی ۱۹۶۱ء (۸/۱ صفحہ 65)

۹۔ جہانگیر نے ایک مصرعہ کہا ؎ دُرِ ابلق کسے کم دید موجود + مصاحبوں سے کہا دوسرا مصرعہ کہہ دو۔ کوئی کُہہ نہ سکا پردے کی اوٹ سے نور جہاں بولی ؎ مگر اشکِ بُتانِ سُرمہ آلود (۸/۱ صفحہ ۷۶)

۱۰۔ لکھنؤ شہر کے سب سے بڑے ہوٹل کارلٹن میں شہر کے معززین کا مجمع کئی سو کی تعداد

میں ہے۔ ہندو مسلمان سب ہیں ــــ یوپی کی نئی لسانی کمیٹی کے صدر اچاریہ کرپلانی بھی جلوہ افروز ہیں اور یوپی کے چیف منسٹر گپتا جی بھی۔ بھلا لکھنؤ کی کوئی اجلی نستعلیق صحبت ہو اور اس میں شعر و شاعری نہ ہو۔ چائے نوشی کے بعد شعر خوانی کا دور بھی چل رہا ہے۔ سب کان لگا کر سنتے ہیں "مکرر" ایک شعر کے بعد ہال اس آواز سے گونج اٹھا اور مکرر ارشاد ہو کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ شعر یہ تھا۔

ے دی ہے مجھے دوآبۂ گنگ و جمن نے جو زبان (اردو) آج اسی کو حکم ہے گنگ و جمن سے دور دور

اور یہ کلام ملّا کا ہے۔ کوئی مُلّائے مسجدی یا مُلّائے مکتبی نہیں بلکہ اردو کے قدیم پرستار یادگارِ نسیم و سرشار یوپی ہائی کورٹ کے جج جسٹس آنند نرائن مُلّا!" مولانا ماجد دریابادی۔ صدقِ جدید۔ ۲۸ ، جولائی ۱۹۶۱ء (۸/۱ ص ۷۳)

۱۱۔ ۲۴ ، شعبان المعظم ۱۳۸۱ھ مطابق ۳۰ ، جنوری ۱۹۶۲ء یوم سہ شنبہ رات کے پورے سوا گیارہ بجے حضرتِ والدِ محترم قبلہ خواجہ صدر الدین بچھ ابنِ خواجہ عبدالبنی بچھ صرف سات گھنٹے کی علالت کے بعد واصل بحق ہوئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ عرش آشیانی قبلہ والدِ محترم نے ہنستے ہنستے موت کو لبیک کہا۔ اللہ کا نام لے کر۔ یہ نامۂ سیاہ اس وقت انکی خدمتِ اقدس میں حاضر تھا میں نے بچشمِ خود مردِ مومن کا وہ نشان دیکھا جس کے متعلق ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے کہا ہے ے چو موت آید تبسم برلب اوست ،

حضرت والدِ محترم کی وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ آستانۂ نقشبندیہ پر ادا کی گئی اور پھر وہ اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے ، حضرت والدِ محترم نقشبندیہ مسلک کے سالک تھے۔ حضرت بہاء الدین محمد نقشبندِ مشکلکشا (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کو اپنا پیرِ طریقت سمجھتے تھے اور صحیح معنوں میں فنا فی الشیخ تھے۔ جونہی وہ شاہ نجار رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سنتے تھے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور بڑی دیر تک ان پر ایک عجیب سرور انگیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ (۸/۱ ص ۷۵)

۱۲- ے اہلِ کاران بہ وقت معزولی شبلیٔ وقت و بایزید شوند

بازچوں مے شوند بر سرِ کار شمرِ ذی الجوشن و یزید شوند

اِس بات کا ثبوت ہمیں کشمیر میں ۱۹۴۷ء سے تا حال سال بہ سال مِلتا رہا ہے۔ معزولی کے وقت اہلِ کار (ایم ایل اے) نیک بندے اور عوام کے ایسے ہی خواہ بنتے پھرتے ہیں کہ ع سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ لیکن جونہی پھر سے بر سرِ کار ہو جاتے ہیں تو فوراً اُن کا حال ایسا تبدیل ہو جاتا ہے کہ اُن جیسا ظالم، فرعون مزاج، نمرود صفت اور شیطان خصلت دنیا جہاں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ ۳۰، جولائی ۱۹۶۵ء (۸/۱ ص ۲۹)

۱۳- (۲۰، اپریل ۱۹۶۷ء کے روز مرحوم بڑھ صاحب ۸/۱ کے صفحہ ۱۰ پر اپنے چھوٹے بھائی محمد یوسف بڑھ کو مرحوم عبدالحق برق کی جانب سے بھیجے گئے خط کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں) یوسف سلمہٗ اپنے وطنِ مالوف سے انیس سال سے دور رہا ہے۔ وہ کشمیر سے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے ظالم و جابر حکومتِ وقت کے حکم کے تحت پاکستان چلا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہاں سے امریکہ چلا گیا۔ جب سے وہ وہاں رہ رہا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں وہ بیت اللہ کی زیارت، حرم نبویؐ کی آستان بوسی اور فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے سعودی عرب آگیا۔ کشمیر سے اُنکی والدہ ماجدہ بھی فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے چلی گئیں۔ اس طرح بیت اللہ اور وطنِ رسولؐ میں ماں بیٹے کی ملاقات انیس سال کے بعد ہو گئی دونوں ماں بیٹے اکھٹے چون ۵۴ دن رہے اور اکھٹے فریضۂ حج ادا کیا۔ برقؔ نے (مدینہ پاک میں قیام کے دوران) اپنے دوست یوسف سلمہٗ کو خط لکھا۔ مختصر ترین اشعار پر مشتمل۔ وَھُوَ ھٰذا:-

ے گماہ، پھرا، ہنا ساتھا، بہتھ کرہو کھتا باتھا

اما آمیا سہ کا منہ ساتھا؛ بنیا زا ننہ ترٹھ کراماتھا

مدنیس منز ژھ چھکھ وآصل تبے چھیٔ از قربِ حق حاصل

اتی کرا کھ مُناجاتھا، ادے بنہ اکھ مُلاقاتھا

خط گویا ہے۔ تشریح کا محتاج نہیں (ام ال)

۱۴۔ ہمارے شیرین زبان شاعر میر غلام رسول نازکی نے کیا خوب کہا ہے ؎

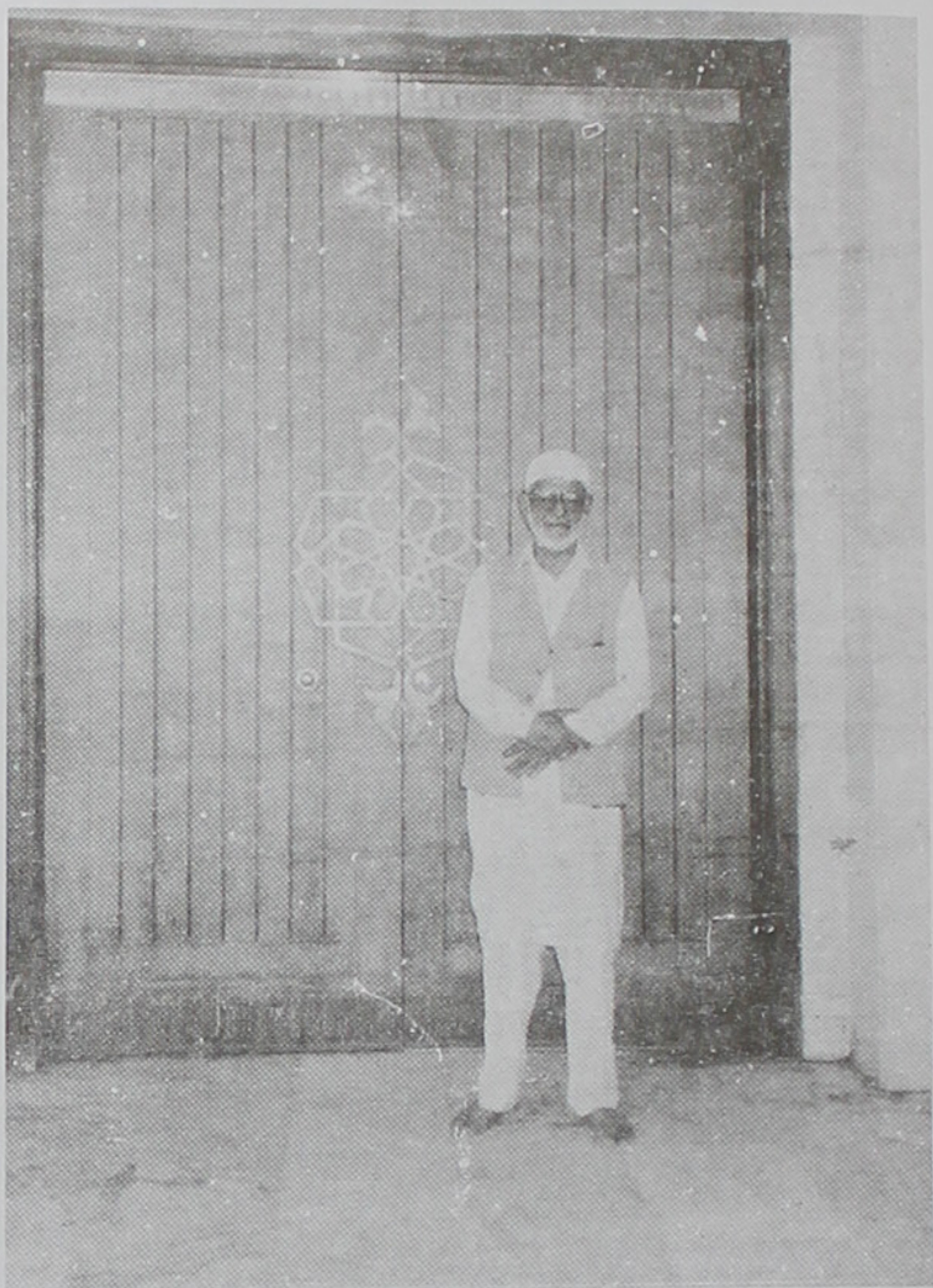
جوانی گژھ مے بییہ دوہہ تارہ واپس | جوانی راوہ راوتھ چھم تمنا
وونی بیلیہ دوہہ لوس ترووم دانہ تالیس | بوچھس نی نارہ وزنی ہیوت کھنن کیشور

..... یہ احساس کہ جوانی اور عالم شباب ضایع ہو گئے۔ پیری اور بڑھاپے میں تہی دستی ہے۔ سفید بالوں کے ساتھ روسیاہی کا عالم ہے۔ آج تک جیئے لیکن بے مقصد۔ صرف پیٹ کی فکر کی۔ تنور شکم کو گرم رکھا اور روح کی بالیدگی کا کوئی سامان بہم نہیں کیا۔ یہ احساس شاید ندامت پر مبنی ہو اور اگر واقعی ندامت ہو جائے تو تھوڑی سی اُمید بندھ جائے گی کہ عرقِ ندامت سے عصیاں کے داغ دُھل جائیں گے اور اپنے خالق کے ہاں یہی عرقِ انفعال توشہ کے طور پیش کیا جا سکے۔ اِغفر ذنبی یا عفّار..... ۲۳ مئی ۱۹۶۲ء (۸/۱ ص ۷۶)

۱۵۔ پیر عبدالقادر آثم مرحوم ایک علمی پیرزادہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی میں شاعری کی ہے اور خوب شعر کہے ہیں۔ مولانا حیرت کاملی کے ساتھ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا بڑی مدت تک رہا۔ حیرت آثم کی شاعری کے مداح ہیں۔ آثم علم و فضل کے علاوہ دلِ پُردرد رکھتے تھے اور ہر چیز کو غائر نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی چند غزلیں سرینگر کے رسالہ گلریز (۱۹۵۲ تا ۱۹۵۵) میں شائع ہوئی ہیں۔ آثم کے دو صاحبزادے پیر غلام حسن اسسٹنٹ رجسٹرار جموں و کشمیر یونیورسٹی اور پیر علی محمد لیکچرار زبان و ادبیات انگریزی ہیں۔ اُن سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کا کلام جلد مرتب اور شایع کریں گے۔ تاکہ اربابِ ذوق اس سے استفادہ کر سکیں۔ نمونہ کلام ؎

مہہ کاست تا مقابلِ ابروشود دلشد | گُل خواست تا برابرِ آن رُو شود دلشد
ہندوی خالِ آن بتِ ہندو شود دلشد | آثم زکعبہ گشت روان سوے دیر، تا

مرحوم برشہ صاحب کی ۱۹۶۷ء میں فرزندانِ آثم کے ساتھ وابستہ کی گئی توقع چھبیس سال گزرنے کے باوجود اب تک بھی پوری نہ ہو سکی ہے! ——— ●●



بچھ صاحب مسجد نمرہ میں

ے وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



ابن صاحب کی یاد میں انکی رہائش گاہ پر ادیبوں کا جلسہ
حافظ عبدالحمید تلاوت کلام اللہ کر رہے ہیں۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیرٌ

اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں کائینات وماورائے کائینات کی ہر کوئی شئی ہے۔ اللہ کے کارخانۂ قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔ عقل یہاں بے بس ہے۔ علم انسانی اللہ کی قدرت کاملہ کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ بجز تسلیم و رضا کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ جس شئی کو عقل انسانی اپنے دائرہ میں لا سکے اس سے علیٰحدہ لاتعداد اشیا ہیں، جنہیں انسان دیکھ لیتا، محسوس کرتا اور ان سے استفادہ کرتا ہے، مگر انکی ماہئیت پرکھنے سے قطعاً عاجز ہے۔

دنیا کے اس حصہ میں جسے کشمیر کہتے ہیں، ہزارہا بلکہ لاکھوں سال سے چار موسم یکے بعد دیگرے بدلتے رہتے ہیں۔ ان موسموں کی اپنی اپنی خوبیاں اور خامیاں بھی ہیں۔ ان موسموں میں بارشیں ہوتی ہیں، خاص طور پر سرما میں اور مارچ اور اپریل میں زبردست بارش ہوتی ہے، بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے۔ سبزہ نکل آتا ہے۔ پھولوں کی بہار ہوتی ہے، شگوفے کھلتے ہیں اور شگوفوں کے بعد ثمردار درختوں پر سبز پتے نمودار ہوتے ہیں۔

بہار کے اوائل میں بارشیں ہونا بالکل قدرتی بات ہے، اور پھر بہار کے آواخر میں بارشیں تھم جاتی ہیں۔ انگلستان کی طرح مارچ کی ہوائیں اور اپریل کی بارشیں مئی کے پھولوں کو لے آتی ہیں۔ مگر بہار کے اَواخر میں ۳۰/۲۹ تاریخ کو برف پڑنا اور درجۂ حرارت کا انجماد کے نقطے پر نیچے اترنا بڑے بوڑھوں نے بھی سنا نہیں ہے۔ لیکن

اللہ جلّ شانہٗ علیٰ کُلِّ شیئٍ قدیر ہے، وہ قادرِ مطلق ہے۔ اسے جس چیز کی منشا ہو وہ ہو کے رہے گی۔ اللہ نے چاہا، تو ۲۹، اپریل ۱۹۶۹ء کو خطۂ کشمیر میں بڑی شدید برف پڑی۔ ساری گلپوش وادی برف پوش ہو گئی۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ گئے، حتیٰ کہ چنار جن کی ٹہنیوں پر سبز پتے نمودار ہونے لگے تھے، برف کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکی اور ان بڑے درختوں کی ٹہنیاں کٹ گئیں۔ وادی میں کہرام مچ گیا، کوئی کہے کہ یہ لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ ہے، کوئی کہے لو جی آثارِ قیامت یہی تو ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ انسان باوجود عروج و ترقی کے عقل میں، علم میں قدرت کے آگے حقیر سی شے کے مترادف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اس قدر معراجِ کمال پر پہونچا کہ وہ چاند کو تسخیر کرنے کا بندوبست کر رہا ہے، مگر جہاں اللہ نے چاہا اسے بے بس کر کے رکھدیا۔ ۲۹، اپریل کو سارے خطہ میں شدید برفباری اور ۳۰، اپریل کو پھر کھلی دھوپ، جس سے سارے خطہ میں زندگی کی ہماہمی دیکھنے میں آئی۔ القصہ ہم ایمان لے آئے اور اسکی شہادت دیدیتے ہیں کہ اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیر ہے اور ہم محکوم و مجبور ہیں۔

ے تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبحگاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تری پادشاہی



ثنائے خواجۂ کونینؐ

ے نبی بود آں زماں ختم النبینؐ — کہ آدم بود بین الماء و الطین

ہمارے ہادی، نبیوں کے خاتم محمد عربی روحی فداہٗ اس وقت نبی تھے۔ جب آدم ابوالبشر ابھی پانی اور مٹی کے درمیان بشر کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ ان کا خمیرا ابھی بن رہا تھا۔

سبحان اللہ۔ کیا شان ہے ہمارے سردار، عرب و عجم کے ہادی، رحمۃٌ للعٰلمین، شفیع المذنبین، آقائے دو جہاں محمد مصطفٰے روحی فداہ کی۔ وہ سید البشر، جن کی تعریف و توصیف پر قرآن شاہد ہے۔ بقول ابوالکلام آزاد۔ "بائے بسم اللہ سے سین والناس تک جو کچھ ہے، گویا حکایت موسیٰ کلیم اور یوسفِ صدیق کی صلواۃ اللہ علیہما لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی ہے اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخن اسی طرف ہے۔

ع چشم سوی فلک و روئے سخن سوی تو بود"

ان کے صاحب جمال ہونے پر شمس و قمر بھی قربان ہیں، وہ سراجِ منیر ہیں۔ جس قدر انکی مدح و ثنا کی جانی چاہیئے ممکن ہی نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ خدا کے بعد بزرگ ترین ہستی ہیں:

●

عبادت

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

بنی نوع انسان اور دوسری مخلوقات کی خدمت کرنے ہی سے عبادت مکمل ہوسکتی ہے، صرف اوراد و اذکار اور نماز ادا کرنے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے عبادت نہیں ہوسکتی ہے۔

ایک شخص اوراد و اذکار پڑھتا رہتا ہے، تسبیح کے دانوں پر اوراد کا شمار کرتا رہتا ہے۔ سجادہ ہر وقت اس کے پاس ہی رہتا ہے، اس کے ملبوسات پھٹے پرانے ہیں وہ زینت بدن کی طرف لاپرواہ ہے، دلق پوش ہے، اگر صرف اتنی ہی سی بات ہے تو وہ شخص صحیح معنوں میں عابد نہیں ہے۔

اس سے علیحدہ دوسرا شخص ہمہ وقت خدمت خلق میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان بلکہ تمام ذی حیات مخلوقات کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ وہ شخص عابد ہے۔ اسے دوسروں کا دکھ دکھ پہونچاتا ہے۔ اسے دوسروں کی تکلیف سے تکلیف پہونچتی ہے۔ اُسے دوسروں کے درد سے اذیت ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت خدمت خلق میں اپنے مقصد حیات کو پالیتا ہے یہ شخص بالیقین عابد ہے۔ اس کی یہ خدمت عبادت سے عبارت ہے۔ وہ اللہ کی مخلوق کو اپنے جسم کا حصہ سمجھتا ہے۔ اس کا مقام عالمِ انسانیت میں بہت اونچا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ تسبیح سجادہ سے کٹ جائے۔ نہیں۔ نماز فرائض میں شامل ہے وہ اس سے منکر نہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے اور روح کی طہارت کے لئے نماز پڑھ لیتا ہے۔ وہ تسبیح کی بڑی عزت کرتا ہے، مگر وہ اپنی ذات سے آگے چلا جاتا ہے اور دوسروں کی خدمت کرنا اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ ؛؛

حلال و حرام

کہتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ایک روز گھوڑے پر کہیں جا رہے تھے۔ ایک نزدیکی بستی سے اذان کی آواز آئی۔ مولا علی نے چاہا کہ نماز مسجد میں جا کر ادا کریں۔ مگر گھوڑے کو کہاں رکھیں۔ کوئی پیڑ، کوئی درخت ایسا نظر نہ آیا، جس کے ساتھ اسے باندھ دیں۔ اتفاقاً ایک آدمی نظر آیا۔ اسے کہا۔ بھئی اس گھوڑے کو ذرا پکڑے رکھو میں نماز پڑھ کے آجاؤں۔ اس نے گھوڑا ان سے لیا اور مولا علی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ بعد ادائے نماز وہ باہر آئے تو بائیں ہاتھ میں آٹھ درم رکھ لئے کہ اس شخص کو انعام کے طور دیدوں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نہ گھوڑا باہر اور نہ وہ آدمی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ دور ایک جگہ ریگستان میں گھوڑا نظر آیا۔ جا کے اسے پکڑ لیا۔ مگر اسکی لگام غائب تھی۔ نزدیک کی بستی میں گئے کہ کہیں لگام خرید لوں۔ ایک آدمی سے پوچھا۔ اس نے کہا ابھی ابھی ایک شخص نے گھوڑے کی لگام آٹھ درم میں بیچ دی ہے۔ آٹھ درم دیکر لے لیجئے۔ مولا علی نے آٹھ درم جو ان کے ہاتھ میں تھے ہی اس شخص کو دیدیئے اور لگام اس سے لے لی۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ دیکھیئے اس شخص کو آٹھ درم ملے مگر حرام طریقے سے۔ چوری کرنے سے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور حضرت علی کا انتظار کرتا اور آٹھ درم انعام پاتا۔ اُس طور یہی آٹھ درم حلال طریقے سے ملتے۔ حضرت علیؓ نے کس دلنشین پیرایہ میں حلال اور حرام کے معانی سمجھائے۔

●

محنت شاقہ اور مستقل مزاجی

انسان محنت شاقہ اور مستقل مزاجی سے ہر مشکل پر قابو پانے کا اہل ہے۔ اس نے مشکلوں کو آسان کر دیا ہے۔ تیمور ناکامیوں سے گھبرایا تو جنگل میں بھاگ گیا۔ وہاں ایک جگہ ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک چیونٹی چاول کا دانہ لیکر دیوار پر چڑھنے کی سر توڑ کوشش کرتی ہے۔ ستر بار وہ گر پڑی مگر وہ بار بار دانہ بر نخ لیکر چڑھتی رہی حتیٰ کہ اکہترویں بار وہ اپنی منزل مقصود پر جا پہنچی۔ تیمور چونک پڑا یہ دیکھکر۔ اس کے بدن میں رعشہ طاری ہوا۔ یہ ایک حقیر سی چیونٹی کی ہمت ہے کہ وہ مشکلوں سے گھبرا نہیں گئی اور ہمت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا وہ بار بار ناکامی کا منہ موڑ کر محنت کرتی رہی۔ اگر چیونٹی میں یہ ہمت ہے تو تیمور کو کیا ہو گیا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے میدان کی طرف دوڑتا بھاگتا چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا۔ اسے فتح حاصل ہوئی اور پھر فتح پر فتح حاصل کرتا ہوا ترکستان سے نکل کر افغانستاں کو اپنے زیر نگین لایا اور ہندوستان پر بھی چڑھائی کی، جہاں صدیوں تک اسکی اولاد حکومت کرتے رہے۔

دنیای حاضر میں برطانیہ کا مشہور ادیب، بلند پایہ عالم جارج برناڈ شا اس صدی کا سب سے عظیم المرتبت ڈرامہ نویس گزرا ہے۔ جو اپنی جوانی میں علمی مشاغل میں ایک کمتر درجہ کا طالب علم تھا۔ صرف محنت شاقہ سے وہ علم کے اونچے زینہ پر فائز ہوا۔ وہ خود کہتا ہے۔

"جب میں جوان تھا۔ میں نے دیکھا کہ دس چیزوں میں سے جو میں نے کیں تو میں ناکام ہوا۔ مگر چونکہ میں ناکام ہونا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے دس گنا زیادہ کام کیا۔"

ایرانی شاعر نے بہت خوب کہا ہے ؎

مشکلے نیست کہ آسان نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

●●

حسن کا شعور

ایک امریکن ادیب اور شاعر ایک مرتبہ نیویارک کی ایک بڑی سڑک پر کھڑا تھا تو اُسے سڑک کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر ایک نہایت ہی حسین وجمیل خاتون نظر آئی۔ شاعر فوراً دوڑ پڑا۔ جان کو خطرہ میں ڈال کر سڑک پار کر کے اس کے پاس گیا اور اسے کہا

I THANK YOU FOR BEING SO BEAUTIFUL.

اس قدر حسین ہونے پر شکریہ کہتا ہوں۔

یہ حسن کا تفہیم وشعور ہے۔ صرف شکریہ کہا۔ حسین خاتون کو اپنانے کے لیے شاعر دوڑا نہیں پڑا۔ اسے گلے لگانے کے لیے وہ اسکی طرف لپک نہیں پڑا۔ اُسے چومنے کے لیے وہ بے قرار نہیں ہوا۔ اپنانا۔ گلے لگانا اور بوسہ لینا یہ تینوں خواہشات شہوت، خود غرضی اور نفس پرستی پر مبنی ہوتے۔ شاعر نفسانی خواہشات سے بہت بلند تھا۔ اس کا جذبہ صالح تھا۔ خلوص سے مملوُ۔ اس نے اس خاتون سے ہاتھ تک نہیں ملایا۔ صرف اس کا شکریہ کہا، کہ وہ اس قدر حسین ہے۔ کتنا مقدس جذبہ ہے جس میں جنسی خواہش، نفس کی ہوس اور شہوت کی لذت کا کوئی شائبہ نہیں۔

کیا فرماتے ہیں فرائیڈ اور علمائے نفسیات اس مسئلہ میں۔ انہیں ہر کسی مردانہ و زنانہ حرکت میں شہوت نظر آتی ہے۔ ❊

●

قول زریں

شیکسپیئر نے کیا خوب کہا ہے۔

"TO THINE OWN SELF BE TRUE"

اپنی ذات کے ساتھ صداقت روا رکھو۔

ہر انسان سمجھتا ہے کہ اپنی ذات پر اُسے مکمل اختیار حاصل ہے۔ جو چاہے پہن لے، جو چاہے کھائے۔ جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے اور جس طرح چاہے رہے۔ لیکن اپنی ذات کی حفاظت کے لئے اسے قانون قدرت کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ سردیوں میں گرمی فراہم کرنے کے لیے مناسب لباس، مناسب خوراک وغیرہ اسے استعمال کرنا پڑتا ہے، اور گرمیوں میں اسی طرح تحفظِ ذات کے لیے آرام و آسائش کے سامان اُسے فراہم کرنا پڑتے ہیں۔ یہ تو رہی انسان کے جسم کی حفاظت کی بات۔ ذات مجموعہ ہے جسم اور روح کا۔ جسمانی تحفظ کے ساتھ ساتھ روحانی تحفظ بھی لازمی ہے۔ روح کی حفاظت مذہبیات اور اخلاقیات کے قانون کی پیروی کرنے سے ہوتی ہے۔ مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں

کی پیروی ۔ اخلاقیات کے ضابطوں کی پیروی تحفظِ ذات کی ضامن ہے، جس سے روح جملہ علتوں سے محفوظ رہتی ہے ۔ جب انسان بھٹک جائے تو وہ ایک طرف بنی نوع انسان کو دھوکہ دے سکتا ہے انہیں جھوٹ سے کسی راہ پر ڈال سکتا ہے تو دوسری طرف اپنی ذات کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے، چاہے اس کا ضمیر اسے ملامت کرے کہ تو خود فریبی سے کام لیتا ہے ۔ جو خود کے ساتھ جھوٹ برتتا ہے، مگر اس ملامت ضمیر کے باوجود انسان اکثر دل و دماغ کو ہم آہنگ نہیں رکھ لیتا ہے اور اپنے کو دھوکہ دے دیتا ہے ۔ اس وقت اس کا دماغ اس کے شیطانی جذبات کے تابع رہتا ہے اور دل کو مغلوب کر دیتا ہے ۔ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کی رگوں میں شیطان خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے اور یہ شیطان ہر وقت اس کوشش میں مصروف ہوتا ہے کہ اس انسان کو جھوٹی راہ پر ڈال دے ۔ ہر کوئی انسان اس کے بہکاوے میں آجاتا ہے اِلّا صالح بندے ۔ ✿

عرفی کا ایک شعر

قوموں اور ملکوں کی تقدیریں بدلنا اور انہیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگانا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے غیر معمولی صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ مقصد و نصب العین کے سچے شیدائی مشکلات اور مواقع سے گھبرایا نہیں کرتے بلکہ اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیتے ہیں اور اپنی ہمتوں کو استوار بنا لیتے ہیں۔ عُرفی نے اپنے مشہور شعر میں اسی حقیقت کبریٰ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

جن کے ذمے کارواں کی امارت اللہ میاں سونپ دیتا ہے اور جنہیں یہ فرض تفویض کر دیتا ہے، وہ استقامت و استقلال کے غیر معمولی جواہر سے مالا مال ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہمسفروں اور ہم نشینوں کی کمزوریوں کی بنا پر اپنے مفوضہ کام سے دست بردار نہیں ہوتے اور نہ ہمت ہار دیتے ہیں۔ وہ ان کے تذبذب اور بے ہمتی سے پریشاں نہیں ہوتے اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک پیش نظر مقاصد کے لیے تدبیریں سوچتے اور اسباب فراہم کرتے رہتے ہیں۔ عرفی کا شعر ان کے کردار کا آئینہ دار ہے۔ انہیں اپنے کام سے کام ہے۔ وہ اسی میں لگن ہے۔ ماحول کی ناخوشگواری۔ ابنائے زمانہ کی بے اعتنائی، ہمسفروں کی بے رُخی، ہم نشینوں کی علاحدگی اور اعدا کی دشمنی اس کے راستے میں روڑے اٹکا کر بھی انہیں کم ہمت نہیں کر دیتے ہیں۔ ٭

●

مولانا حیرت کاملی قدس سرہٗ

مولانا شمس الدین حیرت کاملی ــــ کشمیر کے سب سے بزرگ سربرآوردہ شاعر اور صوفی اس دنیا سے اٹھ گئے، اور اعلیٰ علیین میں جاگزین ہوئے۔ یہ خبر سن کر مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ پنتالیس سال کی رفاقت۔ ان کے نیاز سے مشرف ہو کر میں بہت حد تک مستفیض ہوا ہوں۔ ان کے روحانی مراتب سے میری آنکھیں کھُل گئیں۔ میری روح کا کرب واضطراب کسی حد تک اگر کم ہوا تو یہ انکی رشد وہدایت کا کرشمہ ہے۔ مولانا حیرت ایک ولی اللہ تھے۔ مولانا کے سانحہ ارتحال پر میں نے انکے صاحبزادے میر رشید کاملی کو خط لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خِیَارُکُمُ الَّذِیْنَ اِذَا رُءُوْا ذُکِرَ اللہُ

(تم میں بہترین لوگ وہ ہیں کہ انہیں دیکھکر خدا یاد آتا ہے)

جموں

۱۸ ار دسمبر ۶۸ئہ

جگر بیاد عتیق لعلش یمن نہ گردد دگر چہ گردد
دل از ہوای عبیر زلفش ختن نہ گردد دگر چہ گردد

عزیزی رشید صاحب :: سلام مسنون۔

یں نے کل شام یہاں سرینگر کا ایک اخبار چنار پڑھا۔ جس یں یہ خبر پڑھکر میں اپنی سدھ بدھ کھو گیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میرے اضطراب و اضطرار کا عالم مجھے عالم بالا میں لے جاتا اگر میں سنبھل نہ جاتا۔ جب میرے کانوں یں یہ خبر پڑی کہ پیر طریقت میرے آقا اور آپ کے والد ماجد حضرت مولانا حیرت کاملی واصل بحق ہو گئے۔ اُف کسقدر روح فرسا اور دلدوز خبر ہے ہمارے لیے۔ میرا دل رویا کہ میں کیوں نہ انکی دنیوی زندگی کے آخری مقدس لمحات یں ان کے پیر چومنے کے لیے حاضر خدمت تھا۔ کس قدر بلند بخت ہے وہ خاک جہاں باغ محمدؐی کا یہ بلبل خوش آہنگ آسودہ ہے۔ وہ اولیائے امت یں سے تھے اور اونچے درجے کے عاشق تھے اور انکی شاعری ان کے عشق کا ایک پرتو ہے۔ وہ روح لطیف تھے اور انکی روح کی لطافت کسی وقت ان کے نازک بدن کے لئے باعثِ زحمت ہوتی تھی اور نزاکت جسمانی اس لطافت روحانی کو برداشت کرنے سے کبھی منہ پھیر لیتی۔ جب پر مولانا تبسم فرماتے "دیکھئے روح لطیف اور بدن نازک یں کشمکش جاری ہے اور یں اس کشمکش لطافت و نزاکت کا تماشہ کر رہا ہوں۔" سبحان اللہ کسقدر لطیف ہوتی ہیں اللہ والوں کی باتیں۔ کسقدر صبر آزما ہوتا ہے اللہ والوں کا حوصلہ......

میرا دل رو رہا ہے۔ آپکے غم یں برابر کا شریک بلکہ یں زیادہ غمزدہ ہوں۔ کیونکہ آپ دونوں بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ یں نے مولانا کے پیر پینتیس سال چومے ہیں۔ والسلام

غمزدہ امین

ایک خط

مکتوب الیہ "جناب عبدالحق برق بمقام جالندھر"

دل کو کیا ہو گیا خدا جانے کیوں ہے ایسا اداس کیا جانے

سلامت باشی۔ تمہارا خط مورخہ ۲۲۔ ماہ حال ملا۔

شعر متذکرہ صدر داغ کا ہے۔ اس نے میرے دل کا حال نہ معلوم کیسے معلوم کیا تھا۔ جو کہہ گیا ہے۔ دل کو کیا ہو گیا خدا جانے۔ یہ دل کا معاملہ بھی عجیب عالم ہے۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب دل کو ایسی بیقراری، بے چینی اور بیکلی سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ذرا سی بیکلی ہوتی تھی۔ یہ حال اس عہد کا تھا۔ لیکن آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ذکر کیا کروں بجز اس کے

یا دل پہ کوئی زخم نہ تھا جُز نمود داغ
یا اب یہ بڑھ گیا ہے کہ ناسور ہو گیا

—— میری عمر ایک نمود غبار و جلوہ سراب سے کم نہیں۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس اور اس کی روداد غم نامۂ ہجراں ہے اور کچھ نہیں۔

تم بتاؤ کب آ رہے ہو۔ گورداس پور۔ سرہند شریف، انبالہ وغیرہ مقامات کا دورہ

اس گرمی میں۔ اللہ پاک تمہیں محفوظ رکھے۔ ان بھارتی شہروں میں اولیاء اللہ ہیں۔ جنہوں نے اس کفرستان میں اسلام کا علم بلند کیا۔ مقدس درگاہوں کی زیارت فرائض منصبی کی انجام دہی کے سلسلے میں کیا خوب ہے۔ بالیقین ان مقامات مقدسہ کی آستاں بوسی طلائے احمر کے برابر ہے۔ انہی اولیاء اللہ کے نفوس قدسیہ کی برکت سے یہاں اسلام پھیلا اور اس اعلائے کلمۃ اللہ میں حضرات سلسلۂ نقشبندیہ علی الخصوص امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے جو رول ادا کیا وہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔

ے
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تم از خود اپنے عیال کو لے کر حال ہی میں ایک مرتبہ سرہند گئے تھے اور وہاں کے انوار عالیہ سے مستفید ہوئے تھے' اب جو پھر جانا ہوا۔ تو قند مکرر کے طور پھر فیض یاب ہوئے۔ میرے لیے ان تمام مقامات عالیہ پر آپ نے دعا کی ہوگی اور جب آپ نے کہا ہوگا۔ وَلِاَحْبَابِنَا۔ تو میں اس میں شامل ہوا۔ اللہ پاک آپکی دعائیں مستجاب فرمائے۔

نیاز آگین
امین

۲۷/۵/۵۸ء



دو دوست جو زندگی بھر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے۔ ابن صاحب
جس روز رحلت کر گئے وہ عبدالحق برق مرحوم کا چہارم تھا۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



امین صاحب اپنے چھوٹے بھائی نقشبند صاحب کے ساتھ۔

Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

ابن صفی صاحب کے

پسندیدہ اور چُنیدہ اشعار

نوٹ:۔ مرحوم ابن صفی صاحب نے اپنی ڈائریوں میں اردو، فارسی اور کشمیری کے ہزاروں اشعار درج کیے ہیں۔ اشعار کے انتخاب سے مرحوم کے حسن نظر، شعر شناسی، سخن سنجی اور وسعت مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ (مرتب)

اردو اشعار

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

(میر تقی میر)

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

(میر تقی میر)

الٰہی کس طرح عقل و جنوں کو ایک جا کر لوں
کہ منشائے نگاہِ عشوہ زا یوں بھی ہے اور یوں بھی

(جگر)

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

(اقبال)

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

(اقبال)

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

(جوہر)

نسیم صبح گلشن میں گلوں سے کھیلتی ہوگی
کسی کی آخری ہچکی کسی کی دل لگی ہوگی

(سیماب)

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(اقبال)

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

(اقبال)

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی — مری دنیا فغانِ صبحگاہی

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور — مری دنیا میں تیری پادشاہی

(اقبال)

برچھی سی کلیجے پر کھٹک جاتی ہے

گل باری حسن صبح گھٹ جاتی ہے

بھرتا ہوں کبھی جو آہ ہنگام سحر

ماہ و انجم کی نیند اچک جاتی ہے

(جوش)

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

(غالب)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(غالب)

کم نظر آتے ہیں جن کو راست آئے فکر و غم

کم ہیں وہ جو ہنس کے پی جاتے ہیں زہرابِ الم

ہاتھ پھولوں کی طرف تنہاؔ بڑھاتے ہیں سبھی

رکھ سکے کانٹوں پہ پاؤں جو نظر آتے ہیں کم

(تنہا انصاری)

مجھکو دربارِ رسول اللہؐ میں جانا ہے آج
نذر کو اِک میری چشمِ تر کوئی گوہر نکال

گوشۂ دل سے کوئی چلتا ہوا جادو دکھا
منقلِ جاں سے کوئی جلتا ہوا اخگر نکال

چاک ہو اِک سینۂ مسلم بشانِ خاوراں
اور پھر اس سے آفتابِ دینِ پیغمبر نکال

حوصلے یوں ہی نکلتے جائیں گے اے دل ترے
آنکھ سے قلزم بہا اور آہ سے آذر نکال

دولتِ قرآں تجھے دیتے گئے ختم الرسل
کھینچ خطِ تدبیر کا تقدیر کا مسطر نکال

صفوتِ صدیقِ اکبر کی دکھا کوئی ادا
سطوتِ فاروقِ اعظم کا کوئی جوہر نکال

حق کے آگے سر جھکا باطل کی قوت سے نہ دب
دل سے غیر اللہ کا ہر مرگ پرور ڈر نکال

شیوۂ مشکل کشائی سے تری طرزِ قدیم
بازوئے خیبر شکن سے قوتِ صفدر نکال

(مولانا ظفر علی خان)

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

(اقبالؔ)

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

فدائے جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائیگی
شبستانِ حرا کا آج وہ ماہِ تمام آیا

جبینِ بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی ترے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا

(اختر شیرانی)

وہ دانائے سبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر

وہی قرآں، وہی فرقاں وہی یاسیں وہی طاہا

(اقبال)

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(اقبال)

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو

جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(انشا)

اب ان بن ہو گئی ہے باغباں سے

مجھے نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

(میر مہدی مجروح)

نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

ہماری باتیں ہی باتیں سید کام کرتا ہے

(اکبر الہ آبادی)

شمع توحید جلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے

بزم کونین سجانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے

ایک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو

ایک مرکز پہ بلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے

پھول وہ پھول خزاں بھی جنہیں مرجھا نہ سکے

باغ ہستی میں کھلانے کے لئے آپ ہو آئے

(ساغر نظامی)

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

(اقبال)

●

فارسی اشعار

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد

در دل اگر بود ہوسِ ملکِ سنجرم

تا یافت جانِ من خبر از حالِ نیم شب

صد ملکِ نیمروز بہ یک جَو نمی خرم

(حضرت پیر کاملؒ)

ملتے چوں می شود توحید مست،

قوت و جبروت می آید بدست

فرد از توحید لاہوتی شود
ملت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال آں را جمال

(اقبالؒ)

از طریقِ آذری بیگانہ باش
برمرادِ خود جہانِ نو تراش
دل بہ رنگ و بوی و کاخ و کو مدہ
دل حریم اوست جز با او مدہ

(اقبالؒ)

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد
دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچینِ بہار تو بہ داماں گلہ دارد

(غنیؒ)

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

(سعدیؒ)

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنایِ محبت کہ خالی از خلل است

(حافظ)

یارب درِ خلق سجدہ گاہم نہ کنی
محتاجِ گدا و پادشاہم نہ کنی
موئے سیہم سفید کردی زکرم
با موئیِ سفید روسیاہم نہ کنی

(حضرت بہاالدین نقشبندؒ)

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جُنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

(عزت بخاری)

کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی

خاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی

اے دوست ادب کہ در حریم دلِ ماست

شاہنشہِ انبیا، رسول عربیؐ

(مولانا گرامی)

یا رسولِ ہاشمی قربانِ نامت جانِ من

جانِ من جانانِ من با جملہ فرزندانِ من

از شعاعِ نورِ پاک تو منور یا رسولؐ

دیدۂ من سینۂ من قلب من قلبانِ من

(جامی)

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

(امیر خسرو)

غالب ثنای خواجہؐ بہ یزداں گذاشتم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

(غالب)

باخرد گفتم نشانِ اہلِ معنی بازگوی
گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

چہار چیز زدل غم برد کدام چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

بگرد اگرد تو چنداں کہ بینم
بلا انگشتری من نگینہ

(بیدل)

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ پرِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

(سرمد)

سرما بگذشت واں دل زار ہما
گرما بگذشت واں دل زار ہما
القصہ تمام سرد و گرم عالم
برما بگذشت واں دل زار ہما

(سرمد)

من نوشتم صرف کردم روزگار
من نمانم ایں بماند یادگار

دل مجلس خود جای مدہ ہمو منے را

آزردہ دل آزردہ کند انجمنے را

(غنی)

پیش منما جمال شہر افروز

چوں نمودی برو پسند بسوز

آں جمالِ تو چیست مستی تو

واں سپندِ تو چیست ہستی تو

(حکیم سنائی)

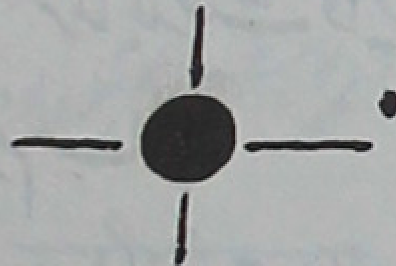
خوننابہ دل خور کہ شرابے بہ ازیں نیست

دنداں بجگر زن کہ کبابے بہ ازیں نیست

از کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را

بر صفحۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

(صرفی)



Title

Author

Accession No.

Call No.

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

محمد امین بچھ مرحوم کشمیر کی معدوم ہوتی ہوئی تہذیبِ خواجگاں کے ایک ایسے نمایندے تھے جن کی شخصیت میں کشمیری سادگی، مشرقی وضعداری اور مغربی ذوقِ تجسس کا ایک غیر معمولی امتزاج تھا۔ وہ ایک سنجیدہ، حساس اور مخلص قاری اور سامع تھے۔ خُم خانۂ حافظؔ کے میخوار، فکرِ اقبال کے محرمِ اسرار، شیکسپیئر کے اندازِ سخن کے پرستار، ذوق و شوق کے اس مجسمے نے کشمیر کی علمی، تمدنی اور ادبی محفلوں میں قاری اور سامع کو کجکلاہی اور سربلندی عطا کی۔

ان کی شخصیت کا ایک تابناک پہلو، اُن کا غیر معمولی حافظہ تھا۔ اردو اور فارسی کے سینکڑوں اشعار انہیں نہ صرف ازبر تھے بلکہ وہ اُن کے برمحل استعمال سے اکثر گفتگو کی سطح کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔

خواجہ محمد امین بچھ انتہائی رچے ہوئے ذوقِ جمال کے مالک تھے اور نفاست، پاکیزگی اور شائستگی کے دلدادہ تھے، خود ان کی ذات ان صفات کا مظہر تھی، اور زندگی کے ہر شعبے میں، خواہ سیاست ہو یا ادب، وہ خوبصورتی اور لطافت کے طلب گار رہتے تھے۔

بچھ صاحب اگرچہ رسمی عالم نہیں تھے، لیکن علم دوستی ان کی کثیر الجہت شخصیت کا ایک ایسا پہلو تھا، جس کا ذکر کئے بنا اُن کا ہر تذکرہ ادھورا ہوگا۔ کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ اُن کا تعلقِ خاطر شخصیت کے اِسی روشن پہلو کا غماز تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے جلسوں اور مختلف تقریبوں میں بلاناغہ حاضری کے علاوہ وہ اکثر انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لاتے تھے اور انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ان کی اسی دلچسپی کی بنا پر انہیں اِس کی ایڈوائزری کمیٹی کا ممبر بھی نامزد کیا گیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ کشمیر کے ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت، بہت دیر تک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یاد رکھی جائے گی۔

پروفیسر محمد امین اندرابی
ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی۔

Published by : IQBAL ACADEMY
Through Book Media, Dalgate Srinagar, Kashmir